Muhammad: The Prophet for our Time

محمد ﷺ

پیغمبرِ عہدِ رواں

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

Marfat.com

Marfat.com

محمد ﷺ

پیغمبرِ عہدِ رواں

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ

نعیم اللہ ملک

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4589419

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۲ء

نام کتاب : محمد ﷺ پیغمبر عہد رواں

تالیف : کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ : نعیم اللہ ملک

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

اہتمام : نشریات، لاہور

قیمت : ۳۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884

فضلی بک سپر مارکیٹ

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 32212991-32629724

Marfat.com

ورفعنا لک ذکرک

خدا کا شکر ہے کہ سیرت النبیؐ پر کیرن آرمسٹرانگ کی دوسری کتاب Muhammad: The Prophet For Our Time کا ترجمہ ''محمدؐ: پیغمبر عہد رواں'' کے نام سے شائع کرنے کی توفیق اور سعادت اس خاکسار کے حصے میں آئی ہے۔ اس سے پہلے اسی مصنفہ کی کتاب Muhammad: A Biography of the Prophet کا ترجمہ ''محمدؐ: پیغمبر اسلامؐ کی سوانح عمری'' اسی سال موسم بہار میں شائع ہوا جسے قبول عام حاصل ہوا، اسے مسلمانوں کے ہر طبقے میں یکساں ذوق وشوق کے ہاتھوں سے لیا گیا اور عقیدت کی آنکھوں سے پڑھا گیا۔ یہ جو کچھ ہے، وہ سب خداوند تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔

ایک ایسی شخصی زندگی، جو ہر طائفہ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہؐ کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ احد سے عبرت حاصل کرو، استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درس گاہ کے معلم مقدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار ومددگار نبیؐ کا اسوہ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمن کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم ونسق درست کرنا چاہتے ہو تو خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اسود کو کعبے کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ وگدا اور امیر وغریب سب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ اور حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، رسول اللہؐ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ہماری سیرت کی درستی واصلاح کے لیے سامان، ہمارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے، اس لیے طبقہ انسانی کے ہر طالب اور نورِ ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف حضورؐ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔ جس کی نگاہ کے سامنے نبی کریمؐ کی سیرت ہے، اس کے سامنے نوح وابراہیم، ایوب ویونس، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں۔

جس کا ذکر خدا نے بلند کر دیا ہے، جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں، جسے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، جس کے شہر کی قسم خدا نے کھائی ہے، جس کی عمر کی قسم خدا نے کھائی ہے، امید ہے کہ اس ذات بابرکات کا تذکرہ میری نجات کا وسیلہ بنے گا۔

امیدوار رحمت
نعیم اللہ ملک

مراکیوال۔ سیال کوٹ
۲ نومبر ۲۰۰۹ء

Marfat.com

ترتیب

تعارف	۵
پہلا باب ۔ مکہ	۱۱
دوسرا باب ۔ جاہلیت	۳۶
تیسرا باب ۔ ہجرت	۶۹
چوتھا باب ۔ جہاد	۹۹
پانچواں باب ۔ سلام	۱۳۲
اشاریہ	۱۶۹

Marfat.com

تعارف

مذہبی روایت کی تاریخ کو اس کرۂ ارض پر رونما ہونے والے موجودہ واقعات اور ایک ہستی مطلق کی ماورائے ادراک حقیقت کے درمیان مسلسل ڈائیلاگ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تمام مذاہب کے پیروکار اپنے مقدس ماضی کا تجزیہ کر کے وہ سبق حاصل کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں جو ان کی اپنی زندگیوں میں پیش آنے والے حالات و واقعات پر براہ راست منطبق ہوتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر ادیان ایک ایسے خیالی پیکر کا بت تراش لیتے ہیں جس سے ان کے مذہبی نصب العین کا انسانی شکل میں اظہار ہوتا ہے۔ بدھ مت کے پیروکار گوتم بدھ کی متین اور پرسکون شخصیت پر غور و فکر اور وجد و استغراق کے ذریعے نروان اور حیاتِ ابدی کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا ہر انسان آرزومند ہے۔ اسی طرح عیسائی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں خدا کی موجودگی کا مشاہدہ کرنے کی جستجو کرتے ہیں جو دنیا میں نیکی اور محبت کا سرچشمہ ہے۔ انسانوں کے تراشے ہوئے یہ مثالی پیکر بسا اوقات ان تیرہ و تار حالات میں مینارۂ نور ثابت ہوتے ہیں جن میں ہم میں سے بیشتر لوگ آلائشوں اور خامیوں سے بھری اس دنیا میں نجات اخروی کے طلب گار ہیں۔ یہی مثالی شخصیات ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ بندۂ خاکی اپنی زندگی کو کس طرح اوجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

اس کرۂ ارض پر بسنے والے مسلمانوں کو ہمیشہ سے اس حقیقت کا کامل ادراک رہا ہے اور وہ اس ارفع نصب العین سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کی مقدس الہامی کتاب قرآن کریم نے انہیں ایک ایسا منصفانہ اور مہذب معاشرہ تشکیل دینے کا مشن سونپ رکھا ہے جس میں معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ احترام پر مبنی سلوک کیا جائے۔ چنانچہ ملت اسلامیہ میں مسلمانوں کی سیاسی بہبود کو ہمیشہ سے زبردست اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی ان کا یہی مطمح نظر ہے۔ ہر مذہبی آئیڈیل کی طرح اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے بھی بے شمار رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہیں البتہ ہر ناکامی نے مسلمانوں کو ایک نیا عزم، ولولہ اور حوصلہ بخشا ہے، وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور انہوں نے شکست کے بعد کارزارِ حیات میں دوبارہ شریک ہونے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیشتر اسلامی عقائد، رسوم، فلسفوں، نظریات، مقدس عبادات اور درگاہوں اور آستانوں

Marfat.com

نے مسلم معاشرے میں بکثرت رونما ہونے والے المناک سیاسی واقعات کی روحانی اذیت اور کرب کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات مقدسہ (۵۷۰ سے ۶۳۲ عیسوی) مسلمانوں کے لیے اسلامی آئیڈیل کا کامل نمونہ رہی ہے اور وہ آج بھی آپؐ کو اسلامی نصب العین کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ حضورؐ کے کیریئر سے اس دنیا میں حدِ ادراک سے ماورا خدا کی موجودگی اور خدا کی کامل اطاعت (عربی زبان میں کامل اطاعت کے لیے اسلام کا لفظ استعمال ہوتا ہے) کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ نبی کریمؐ کی پیروی کرے۔

قرون اولیٰ کے مسلمان آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ کے دوران ہی آپؐ کی سنت کو اپنی عملی زندگیوں میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضورؐ کی رحلت کے ایک سو سال بعد، جب دین اسلام دنیا کے دوسرے علاقوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا اور لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے، مسلمان اسکالروں نے پیغمبر اسلامؐ کی احادیث مبارکہ اور سنن کے وہ عظیم مجموعے مرتب کرنا شروع کر دیے جو اسلامی شریعت کی بنیاد ہیں۔ احادیث اور سنت کے ان مجموعوں سے مسلمان اپنے محبوب پیغمبرؐ کے انداز گفتگو، کھانے پینے، پیار و محبت، طہارت اور عبادت کے طریقوں اور روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معمولات سے واقف ہو گئے۔ وہ اس امید کے ساتھ آپؐ کی سنت پر عمل کرتے کہ انہیں خدا کی کامل اطاعت کے ذریعے آپؐ کی خوشنودی اور قرب حاصل ہوگا۔

تقریباً اسی وقت آٹھویں اور نویں صدی میں ان ابتدائی مسلمان مورخوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت طیبہ کے موضوع پر لکھنا شروع کر دیا جن کے نام یہ ہیں: محمد ابن اسحاق (وفات ۷۶۷ عیسوی)، محمد ابن عمر الواقدی (وفات ۸۲۰ عیسوی)، محمد ابن سعد (وفات ۸۴۵ عیسوی) اور ابو جریر الطبری (وفات ۹۲۳ عیسوی)۔ ان سیرت نگاروں نے محض اپنی یادداشتوں اور تاثرات پر انحصار نہ کیا بلکہ وہ نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تاریخی تشکیل نو کا جائزہ لینے کی کوشش میں مصروف رہے۔ ان ماخذوں میں حضورؐ کے عہد کی دستاویزات اور اصل راویوں کی زبانی روایات شامل تھیں اور اگرچہ وہ خدا کے پیغمبرؐ کی حیثیت سے نبی کریمؐ کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے، اس کے باوجود انہوں نے تمام احادیث اور روایات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ ان سیرت نگاروں کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں ہمیں دنیا کے کسی بھی بڑے مذہب کے بانی کے مقابلے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بہت زیادہ علم ہے۔ آں حضرتؐ کے تمام سیرت نگار ان قدیم ماخذوں کو مستند اور معتبر سمجھتے ہیں اور میں ان صفحات میں ان کے بکثرت حوالے دوں گی۔

Marfat.com

عہد حاضر کا ایک جدید مورخ حضورؐ کے ان سیرت نگاروں کے مجموعوں سے مطمئن نہیں ہوگا۔ ابتدائی سیرت نگار اپنے اپنے عہد کے لوگ تھے اور انہوں نے معجزاتی اور روایتی افسانوی کہانیوں کو بھی اپنی تصانیف میں شامل کر لیا ہے جن کی آج مختلف انداز میں تشریح کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے مواد کی اہمیت اور پیچیدگی سے پوری طرح آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے نہ تو کسی ایک نظریے کی حمایت کی اور نہ ہی واقعات کی تشریح اور توضیح کے سلسلے میں کسی ایک راوی کو دوسرے پر ترجیح دی۔ بعض اوقات انہوں نے ایک ہی واقعے کے بارے میں دو مختلف روایات کو پہلو بہ پہلو من وعن بیان کر دیا اور ہر راوی کو برابر وزن دیا تا کہ قاری خود کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ وہ ان تمام حدیثوں سے ہمیشہ اتفاق نہیں کرتے جو انہوں نے جمع کی تھیں۔ ان کا طریقِ کار یہ تھا کہ انہوں نے رسول کریمؐ کے متعلق تمام واقعات کو نہایت احتیاط کے ساتھ پوری دیانتداری اور راستبازی سے بیان کر دیا ہے۔ ان واقعات کو نقل کرنے کے سلسلے میں تشنگی اور کئی خلا موجود ہیں۔ ہمیں چالیس سال کی عمر میں وحی کے نزول سے پہلے حضورؐ کی پچھلی زندگی کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ کی پیدائش، بچپن اور جوانی کے زمانے کے متعلق ایسی مقدس روایتی قصے کہانیاں عام ہو گئیں جن کی حیثیت محض علامتی تھی اور تاریخی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں۔

مکہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سیاسی کیریئر پر مبنی مواد بھی بہت مختصر ہے۔ اس وقت آپؐ قدرے ایک غیر معروف شخصیت تھے اس لیے کسی نے آپؐ کی سرگرمیوں کی طرف توجہ نہ دی۔ آں حضرتؐ کی سیرت طیبہ کے بارے میں معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن کریم ہے جو آپؐ عربوں کے لیے لائے تھے۔ تقریباً ۶۱۰ عیسوی سے لے کر ۶۳۲ عیسوی میں آپؐ کی وفات تک کوئی ۲۳ برسوں کے دوران رسول اللہؐ پر خدا کی طرف سے براہ راست وحی نازل ہوتی رہی اور اس وحی کے متن کو اکٹھا کر کے قرآن پاک کی شکل دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں حضورؐ کی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم نہیں کی گئیں، یہ وحی ٹکڑوں کی صورت میں ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت، ایک ایک سورت، ایک ایک سطر اور ایک ایک باب کی شکل میں آپؐ پر نازل ہوتی رہی۔ بعض اوقات وحی میں مکہ اور مدینہ میں پیدا ہونے والی کسی مخصوص صورت حال کا تذکرہ کیا جاتا۔ قرآن کریم میں خدا نے رسول پاکؐ کے نکتہ چینوں کو جواب دیا ہے، ان کی دلیلوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور کسی غزوے یا امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے کسی تنازعے کی عمیق سطح پر اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جب کوئی نئی آیت یا سورت رسول اللہؐ پر نازل ہوتی تو مسلمان اسے زبانی یاد کر لیتے اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، وہ اسے لکھ لیتے۔ قرآن مجید کی پہلی مرتبہ باضابطہ تدوین حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد تقریباً ۶۵۰ عیسوی میں ہوئی اور اسے کتاب مقدس کا

Marfat.com

درجہ حاصل ہو گیا۔

قرآن حکیم خدا کے کلام کا مقدس صحیفہ اور اس کی حیثیت کسی شک و شبہے سے بالا، مسلمہ اور قطعی ہے لیکن مسلمان جانتے ہیں کہ اس کی تشریح اور تفسیر بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شروع میں اس کے احکام ایک مختصر برادری کے لیے وضع کیے گئے تھے لیکن رسول کریمؐ کی وفات کے ایک سو سال بعد مسلمان ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکمرانی کرنے لگے جو ہمالہ سے لے کر پائیرنیز تک محیط تھی۔ اب مسلمانوں کے معاملات پیغمبر اسلامؐ اور صحابہ کرامؓ کے حالات سے مکمل طور پر مختلف تھے۔ چنانچہ اسلام میں تبدیلیاں لا کر اسے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا پڑا۔ اسلامی تاریخ میں ابتدائی مضامین اس وقت کی پیچیدہ صورت حال اور مشکلات پر قابو پانے کی غرض سے لکھے گئے۔ مسلمان حضورؐ کی روحانی بصیرت اور سنت کا اپنے عہد پر کس طرح اطلاق کر سکتے تھے؟ آں حضرتؐ کے ابتدائی سیرت نگاروں نے جب آپؐ کی حیات مقدسہ کے واقعات کو قلم بند کرنا شروع کیا تو انہوں نے قرآن کی بعض آیات اور سورتوں کی اس انداز سے تشریح کرنے کی کوشش کی کہ یہ مخصوص آیات کس تاریخی پس منظر اور کن حالات میں حضورؐ پر نازل ہوئی تھیں اور قرآن کریم کی کسی خاص تعلیم کے پس پردہ کیا محرکات کارفرما تھے؟ اس طرح انہوں نے حالات کی مناسبت سے ایک منظم عمل کے ذریعے اس قرآنی تعلیم کو اپنی عملی زندگیوں پر نافذ کیا۔ اس زمانے کے مورخوں اور مفکروں کو یقین تھا کہ ساتویں صدی میں بنی نوع انسان کو خدا کا پیغام سنانے کے سلسلے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جدوجہد کے متعلق علم حاصل کرنے سے ان کی زندگیوں میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ کی سیرت نگاری کا عمل آج تک جاری ہے اور اسے شروع ہی سے محض آثار قدیمہ کا کھوج لگانے کے مشغلے کا درجہ حاصل نہیں رہا۔ بعض مسلمان بنیاد پرستوں نے اپنے عسکری نظریے کی بنیاد آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ پر رکھی ہے، مسلمان انتہا پسندوں کو یقین ہے کہ حضورؐ ان کے مظالم سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کی تحسین کریں گے۔ کئی دوسرے مسلمان ان دعووں سے خوف زدہ ہیں اور کثرت وجود سے متعلق قرآنی تعلیم کی جانب اشارہ کرتے اور تشدد اور جارحیت کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ تمام صحیح مذاہب کا سرچشمہ خدائے واحد کی ذات ہے۔ مغربی کلچر میں اسلام فوبیا کی تاریخ بہت طویل ہے جس کی جڑیں صلیبی جنگوں میں پیوست ہیں۔ یورپ میں بارھویں صدی میں عیسائی راہبوں کا اصرار تھا کہ اسلام تلوار کا ایک پرتشدد دین ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک جھوٹے نبی تھے جنہوں نے متذبذب دنیا پر تلوار کے زور سے اپنا دین مسلط کیا تھا۔ یہ راہب آپؐ کو ایک شہوت پرست اور جنسی اعتبار سے کج رو شخص کہتے تھے۔ (نعوذ باللہ۔ نقل کفر، کفر نباشد۔ مترجم)۔ چنانچہ نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کی مسخ شدہ تصویر کو یورپ میں ایک مسلمہ نظریے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب

Marfat.com

کے باشندوں کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذاتِ گرامی کو زیادہ معروضی روشنی میں دیکھنا ہمیشہ سے بہت مشکل رہا ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد امریکا میں کرسچن رائٹ کے ارکان اور مغربی میڈیا کے بعض حلقے رسولِ خداؐ کے بارے میں جارحیت کی روش پر بدستور کاربند ہیں اور وہ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ آپؐ جنگ وجدل کے خوگر تھے۔ بعض لوگ تو اس معاملے میں اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ انہوں نے حضورؐ کو (نعوذ باللہ۔ مترجم) ایک دہشت گرد اور ہوس پرست انسان کہنا شروع کر دیا ہے۔

اب ہم پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں اس قسم کے متعصبانہ رویے کو جاری رکھنے کے ہرگز متحمل نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارا یہ طرزِ عمل انتہا پسندوں کے لیے تقویت کا باعث بن سکتا ہے اور وہ اس قسم کے بیانات کو یہ ''ثابت'' کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں کہ مغربی دنیا نے عالم اسلام کے خلاف ایک نئی صلیبی جنگ شروع کر دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہرگز تشدد پسند شخصیت نہ تھے۔ حضورؐ کی نمایاں کامیابیوں کا اعتراف کرنے کے لیے ہمیں ایک متوازن انداز میں آپؐ کی حیات مقدسہ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ غیر معقول تعصب کی وجہ سے رواداری، کشادہ دلی اور ہمدردانہ جذبات کو نقصان پہنچ سکتا ہے جسے مغربی کلچر کا نمایاں وصف سمجھا جاتا ہے۔

پندرہ برس پہلے جب آیت اللہ خمینی نے The Satanic Verses میں رسول کریمؐ کی توہین آمیز خاکہ کشی پر سلمان رشدی اور اس کے پبلشرز کے لیے سزائے موت کا اعلان کیا تو میرے خیالات میں مزید پختگی آ گئی اور مجھے اس فتوے سے کراہت محسوس ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ رشدی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو کچھ چاہے، چھاپ دے لیکن اس موقعے پر رشدی کے بعض آزاد خیال حامیوں نے اس فتوے کی مخالفت کی آڑ میں جس انداز سے اسلام کی بلاوجہ مذمت کی، جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا تو میں بے حد پریشان ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں قرونِ وسطیٰ کے تعصب کے دوبارہ ابھر آنے کی وجہ سے آزاد خیالی کے ایک اصول کا دفاع کرنا غلط ہے۔ مجھے یوں لگا کہ ہم نے ۱۹۳۰ء کے عشرے کے المیے سے، جب ہٹلر نے اسی قسم کے تعصب کی بنا پر ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کر دیا تھا، کوئی سبق نہیں سیکھا۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغرب کے بہت سے لوگوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کی تصحیح کرنے کے مواقع میسر نہیں۔ چنانچہ میں نے حضورؐ کے متعلق متعصبانہ خیالات کو چیلنج کرنے کے لیے آپؐ کی عام فہم اور قابل رسائی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ Muhammad: A Biography of the Prophet کی صورت میں برآمد ہوا جو ۱۹۹۱ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ لیکن ۱۱ ستمبر کے واقعات کی روشنی میں ہمیں حضورؐ کی حیات طیبہ کے دوسرے پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یہ مکمل طور پر ایک نئی اور مختلف

Marfat.com

سوانح حیات ہے اور مجھے امید ہے کہ اس میں ۱۱ ستمبر کے بعد کی دنیا کی خوفناک حقیقتوں پر کھل کر اظہار خیال کیا جائے گا۔

رسول کریمؐ کی متنوع اور متضاد شخصیت میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپ کے لوگوں کے لیے بھی اہم سبق موجود ہیں اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے، آپؐ کی پوری زندگی جہاد سے عبارت تھی۔ اصل میں لفظ ''جہاد'' کا مطلب ''مقدس جنگ'' نہیں ''جدوجہد'' ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر جنگ سے تباہ حال عرب میں امن قائم کرنے کی غرض سے عمر بھر انتھک جدوجہد کی اور آج ہمیں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپؐ کی پوری زندگی لالچ، بے انصافی اور غرور و سرکشی کے خلاف جہدِ مسلسل تھی۔ حضورؐ نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ دنیائے عرب انقلاب کے دہانے پر کھڑی ہے اور قدیم اندازِ فکر جدید ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں، لہٰذا آپؐ نے نئے مسئلوں کا حل دریافت کرنے کے لیے تخلیقی کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۱ ستمبر کے بعد ہم تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی ایک مختلف اور نیا نقطہ نظر اختیار کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا ہوگی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ساتویں صدی میں عرب میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے، آج ہمارے اپنے عہد میں بھی اسی قسم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں، ہمیں ایسے واقعات اور ان کی اہمیت سے سبق سیکھنا چاہیے اور سیاست دانوں کے دامِ فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ رسول کریمؐ مذہب کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ کو علم الٰہیات میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی بلکہ آپؐ لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ اپنے عہد کے اندازِ فکر کو جاہلیت سے تعبیر کرتے تھے۔ مسلمان عام طور پر ظہورِ اسلام سے پہلے کے دور کو زمانہ جاہلیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن حالیہ ریسرچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ جاہلیت کی اصطلاح کو کسی تاریخی دور سے نہیں، اس مخصوص ذہنی کیفیت کے لیے استعمال کرتے تھے جو ساتویں صدی کے عرب میں تشدد اور دہشت کا باعث تھی۔ میں تو یہی کہوں گی کہ آج مغرب اور عالم اسلام دونوں جاہلیت کا شکار ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کے نقوش بظاہر مدھم پڑ گئے ہیں کیونکہ آپؐ کی جڑیں اپنے عہد میں پیوست ہیں لیکن ہمیں اس پرآشوب دور میں آپؐ کی کامیابیوں کا ادراک کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آپؐ کن برائیوں کے خلاف نبرد آزما تھے؟ آپؐ کی ذات اقدس سے فیضان پانے کے لیے ہمیں اس المناک دنیا میں داخل ہونا چاہیے جس نے کوئی چودہ سو سال پہلے آپؐ کو نبوت کے منصب پر فائز کیا۔ ہمیں اپنی چشم بصیرت سے اس شخص کا مشاہدہ کرنا ہوگا جو مکہ کے مقدس شہر کے باہر ایک پہاڑ کی چوٹی پر تن تنہا کھڑا ہے۔

Marfat.com

پہلا باب

مکہ

آخر حضورؐ نے اپنے رب کو پالیا لیکن وحی کے اس تجربے کو، جس کے بعد آپؐ شدید جسمانی اور روحانی کرب کے عالم میں پہاڑ کی چوٹی سے دوڑتے ہوئے اپنی اہلیہ کے پاس پہنچے، لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ آں حضرتؐ کو یوں محسوس ہوا کہ ایک دہشت انگیز ذات اس غار میں داخل ہوگئی ہے جہاں آپؐ سو رہے تھے۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ آپؐ کو گلے لگا کر زور سے بھینچا۔ اس ہولناک تجربے کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف یہ تصور کر سکتے تھے کہ آپؐ پر کسی جن نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ ان آتش مزاج ارواح میں سے ایک روح تھی جو عرب کے لق ودق میدانوں میں اکثر آمد ورفت رکھتیں اور مسافروں کو بہلا پھسلا کر انہیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی تھیں۔ یہ جن عرب کے شاعروں، مطربوں اور کاہنوں کے دل میں لطیف خیالات پیدا کرتے اور ان پر وجدانی کیفیت طاری کرتے تھے۔ ایک شاعر نے بتایا کہ جب اس پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہوتی تو اس کا جن کسی انتباہ کے بغیر ظاہر ہوتا، اسے زمین پر گرا دیتا اور اس کے منہ سے شعر کہلواتا تھا۔

(Tor Andrae: Muhammad: The Man and His Faith, p.59)

چنانچہ رسول اللہؐ نے جب روکھے پھیکے انداز میں ''پڑھیے'' کا حکم سنا تو آپؐ نے فوری طور پر یہ اندازہ لگا لیا کہ آپؐ پر بھی کسی جن کا قبضہ ہوگیا ہے۔ ''میں کوئی شاعر نہیں ہوں!'' حضورؐ نے جواب دیا۔ لیکن پیغام خداوندی کی حامل ذات نے آپؐ کو دوبارہ اس قدر زور سے بھینچا کہ آپؐ نے یہ خیال کیا کہ اب موت ہے۔ اس کے بعد آں حضرتؐ کی زبان سے عربی زبان میں پہلی مرتبہ وحی کے الفاظ ادا ہوئے۔

Marfat.com

Marfat.com

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ غزوہ (حصولِ معاش کے لیے حملہ) کو بدوی معیشت میں لازمی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک قبیلے کے لوگ شدید قحط میں اس امید پر ہمسایہ قبیلے پر حملہ کر دیتے کہ اونٹ، مویشی یا غلام ان کے ہاتھ آ جائیں گے تاہم اس کارروائی کے دوران اس بات کی پوری کوشش کی جاتی کہ کوئی شخص قتل نہ ہو کیونکہ اس صورت میں انتقام لینے کا نیا سلسلہ شروع ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں کوئی شخص قتل کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ غزوہ زندگی کی ایک مسلمہ حقیقت تھی اور اس کی بنیاد سیاسی یا ذاتی عناد یا نفرت پر نہیں تھی بلکہ اسے ایک قومی کھیل کی حیثیت حاصل تھی۔ حملے کے دوران طے شدہ اصولوں کی پاسداری کی جاتی، اس میں نہایت مہارت کا مظاہرہ کیا جاتا اور اسے باعث فخر سمجھا جاتا۔ ایک ایسے علاقے میں، جہاں جسم و جان کا تعلق برقرار رکھنے کے لیے زیادہ اشیا دستیاب نہیں تھیں، دولت کی ازسرِنو تقسیم کا یہ آسان اور سہل طریقہ اور اس زمانے کے معاشرے کے لیے ایک ناگزیر فعل تھا۔

اگرچہ مکہ کے لوگوں نے صحرانوردی کی زندگی ترک کر دی تھی، اس کے باوجود وہ صحرانشینوں کو اب بھی مسلمہ عرب کلچر کا امین سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خانہ بدوشی کے آداب اور رسوم کی تربیت دینے کے لیے اپنی دایہ کے قبیلے میں رہنے کی غرض سے ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اس تربیت کا حضورؐ پر گہرا اثر ہوا۔ صحرانشینوں کو روایتی مذہب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں موت کے بعد زندگی پر بھی کوئی اعتقاد نہیں تھا، نہ ہی ان دیوتاؤں پر ان کو اعتماد تھا جو اس کٹھن ماحول میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ خانہ بدوش لوگ دیویوں اور دیوتاؤں کے بجائے قبیلے ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ قبیلے یا گروپ ہی کی بہبود کے آرزومند رہتے اور تمام مرد اور عورتیں قبیلے کو ذاتی ضروریات پر ترجیح دیتے۔ قبیلے کی بقا کے لیے ضروری ہوتا تو اس کے لیے وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ عربوں کے پاس مافوق الفطرت مظاہر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا بلکہ ان کی تمام تر توجہ اس دنیا پر مرکوز تھی۔ بے آب و گیاہ ریگستان میں قوت متخیلہ بے کار محض چیز تھی، انہیں صرف عملیت پسندی اور سنجیدہ و متین حقیقت پسندانہ زندگی اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن انہوں نے عالی ہمتی اور اولوالعزمی کا ایک ضابطہ وضع کر رکھا تھا جس نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ان کی زندگیوں کو بامقصد اور بامعنی بنا دیا تھا اور جس کی بدولت وہ مشکلات کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کر کے مایوسیوں پر قابو پا کر مذہب کا ایک انتہائی اہم فریضہ انجام دیتے تھے۔ اس ضابطے کو وہ ''مروہ'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہ ایک پیچیدہ اصطلاح ہے جس کا مختصر لفظوں میں ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ''مروہ'' کا مطلب تھا مشکلات میں جوانمردی، استقلال مزاجی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا، قبیلے یا اس کے کسی بے کس فرد کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کا بدلہ لینا اور دشمن کو للکارنا! اپنے

Marfat.com

قبیلے کی عزت اور وقار کی حفاظت کی غرض سے ہر فرد کو اپنے عزیز و اقارب کے تحفظ کے لیے ایک لمحے کے نوٹس پر جنگ و جدال کے لیے تیار اور اپنے سردار کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت چاق و چوبند اور مستعد رہنا پڑتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ قبیلے کے ہر فرد کو کشادہ دلی اور فیاضی کا مظاہرہ کرنا اور اپنے مویشیوں اور کھانے پینے کی چیزوں میں دوسروں کو شریک کرنا پڑتا۔ اگر لوگ خود غرضی اور لالچ کے ذریعے دولت اکٹھی کر لیں اور ان کے قرابت دار بھوکے مرتے رہیں تو اس طرح زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا۔ ایک قبیلہ جو آج امیر ہے، کل کو مفلس اور محتاج بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اچھے دنوں میں کنجوسی اور تنگ دلی سے کام لیں گے تو ضرورت کی گھڑی میں آپ کی کون مدد کرے گا؟ ''مروہ'' ضرورت کے وقت ایک بہت بڑی خوبی تھی جس کی بدولت کوئی بھی کریم شخص (سخاوت کرنے والا ہیرو) مادی اشیا اور زندگی کی محرومیوں کی کوئی پروانہ کرتا۔ کوئی بھی شریف النفس خانہ بدوش آنے والے کل کی فکر نہ کرتا۔ وہ قیمتی تحائف اور مہمان نوازی سے یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی اپنی ذاتی املاک سے کہیں زیادہ قدر کرتا ہے۔ اسے اپنی تمام دولت، اونٹ، مال مویشی کے ریوڑ اور غلام دوسروں کو دے دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا اور وہ اپنے دوستوں اور اتحادیوں کی پرتعیش دعوت پر ایک ہی رات میں اپنی پوری دولت نچھاور کر دیتا۔ لیکن ایسے کریم شخص کی فیاضی اور دریا دلی تباہ کن خود نمائی پر منتج ہوتی۔ وہ راتوں رات اپنے خاندان کو غربت اور افلاس کی طرف دھکیل دیتا اور اپنی عزت اور وقار کی دھاک بٹھانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا۔

اس زمانے میں ''مروہ'' کو ایک بے مثل آئیڈیل کی حیثیت حاصل تھی لیکن چھٹی صدی کے آخر تک اس کی کمزوریاں المناک حد تک ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ قبائلی یک جہتی اور استحکام بلاشبہ جرأت مندی اور بے غرضی کے اوصاف پیدا کر دیتا لیکن اس کا اظہار صرف قبیلے کے اندر ہی ہوتا تھا۔ اس دور میں انسانی حقوق کا کوئی آفاقی نظریہ موجود نہیں تھا۔ ایک خانہ بدوش محض اپنے خونی رشتوں اور اتحادیوں کا ذمے دار ہوتا۔ اسے قبیلے کے باہر کے لوگوں کے ساتھ کوئی دل چسپی نہ ہوتی جنہیں وہ بے کار اور فضول سمجھتا تھا۔ اگر اپنے قبیلے کے لیے اسے باہر کے کسی شخص کو قتل کرنا پڑتا تو اسے اخلاقی طور پر کوئی معیوب فعل تصور نہ کیا جاتا۔ چونکہ قبیلے کو مقدس درجہ حاصل تھا، اس لیے اس کے ہر درست یا غلط کام کی حمایت کرنا پڑتی۔ ''میں غازیہ میں سے ہوں!'' ایک شاعر کہتا ہے: ''اگر وہ غلطی پر ہو تو میں بھی غلطی کروں گا اور اگر وہ صحیح سمت میں جائے گا تو میں بھی اسی کی پیروی کروں گا۔'' اس صورت حال کی عکاسی اس عوامی کہاوت سے ہوتی ہے: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے یا اس کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہو۔'' (Ethico Religious Concepts in Quran: p.46)۔

ہر قبیلہ ''مروہ'' کی ان مخصوص روایات پر عمل کرتا جو عربوں کے نزدیک انہیں اپنے آباء و اجداد سے

Marfat.com

ورثے میں ملی تھیں اور جو دوسرے جسمانی اور ذہنی خصائص کی طرح ان میں نسل در نسل منتقل ہوئی تھیں۔ وہ اس قبائلی عظمت کو حسب (آبائی افتخار) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

(Ethico Religious Concepts in Quran: p.63)۔

اپنے مخصوص اوصاف کے سرچشمے کی حیثیت سے قبائلی لوگ اپنے اسلاف پر فخر کرتے اور انہیں ایک برتر سند کا درجہ دیتے جس سے ان کے قدامت پسندانہ جوہر کو تقویت ملتی۔ زندگی کے قدیم طور طریقوں (سنت) کو، جو اسلاف نے آنے والی نسلوں کے لیے ورثے میں چھوڑے تھے، مقدس درجہ حاصل تھا۔ ''اس کا تعلق ایک ایسے قبیلے سے ہے جن کے اجداد نے ان کے لیے سنت قائم کر رکھی ہے۔'' ایک اور شاعر (لبید بن ربیعہ) کہتا ہے: ''ہر قوم اور ہر قبیلے کی اپنی روایتی سنت ہے اور وہ اسی کی پیروی کرتا ہے۔'' (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، گو ان کے باپ دادے بے عقل اور گم کردہ راہ ہوں۔ سورہ البقرہ۔ آیت ۱۷۰۔ مترجم) (نہیں نہیں) بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک مذہب پر پایا اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر راہ یافتہ ہیں۔ اسی طرح آپؐ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا، وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو (ایک راہ پر اور) ایک دین پر پایا اور ہم تو ان ہی کے نقش پا کی پیروی کرنے والے ہیں۔ (نبی نے) کہا کہ اگرچہ میں تمہارے پاس اس سے بہت بہتر (مقصود تک پہنچانے والا) طریقہ لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے منکر ہیں جسے دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے۔ سورہ الزخرف، آیات ۲۲ تا ۲۴۔ مترجم)

آبائی رسوم سے انحراف کو، خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ اور خفیف کیوں نہ ہو، بہت بڑی برائی سمجھا جاتا۔ کسی بھی روایت پر اس لیے عمل نہ کیا جاتا کہ وہ شائستہ اور بلند مرتبت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس روایت پر قبیلے کے آباء واجداد طویل مدت سے کاربند چلے آ رہے تھے۔

خانہ بدوش تجربے کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جو چشمے اور کنوئیں نامعلوم زمانے سے ان لوگوں کی شہ رگ کا درجہ رکھتے تھے، ان تک پہنچنے کے لیے باپ دادوں کے راستوں کو نظر انداز کرنا ایک مجرمانہ غیر ذمے داری تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں عربوں کے لیے صرف ان قواعد پر عمل پیرا ہو کر ہی زندہ رہنا ممکن تھا جو طویل تجربوں کے بعد متعین کیے گئے تھے۔ لیکن قدیم روایات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لینے کے نتیجے میں زائد از ضرورت جنگجویانہ ذہنیت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اپنے لوگوں کی سنت پر کاربند رہنے کا ایک نقصان یہ بھی تھا کہ زندگی میں کوئی دوسری روش اختیار کرنے کے متعلق سوچ بچار نہ کی جاتی۔ اپنے قبیلے کی عزت اور

Marfat.com

وقار کے تحفظ کی خاطر کسی اور انسانی یا آسمانی حاکمیت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا جاتا۔ کریم شخص سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ ایک غیور، عزت نفس کی پاسداری کرنے والا، خود اعتمادی سے سرشار اور حد درجہ آزاد اور خود مختار ہوگا۔ تکبر اور غرور کو عیب نہیں، بڑائی اور شرافت کی علامت سمجھا جاتا جب کہ عجز و انکساری سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کا تعلق کسی کمتر اور ناقص خاندان سے ہے اور آپ کی رگوں میں اشراف کا خون موجود نہیں۔ نیچ گھرانے میں پیدا ہونے والے شخص کو عموماً غلام (عبد) سمجھا جاتا اور اسے غلامی میں ہی زندگی بسر کرنا پڑتی۔ ''ہم دوسرے لوگوں کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔'' ایک شاعر کہتا ہے: ''یہاں تک کہ ہم دوسروں کو نکیل ڈال دیتے ہیں۔'' (Ethico Religious Concepts in Quran: p.72)۔ ایک کریم شخص کسی دیوتا کی موجودگی میں بھی اپنی عزت اور وقار کی حفاظت کرتا کیونکہ کوئی بھی معبود حقیقی معنوں میں ایک شریف النفس انسان سے برتر نہیں تھا۔

بے آب و گیاہ صحرا میں ہر قبیلے کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی جو حالات کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کریں اور جن میں ہر قسم کی مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہو۔ لیکن یہ حد درجہ استغنا لاپروائی اور عاقبت نااندیشی کا ذریعہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ صحرا نورد کسی معمولی اشتعال انگیزی سے انتقام کی آخری حد تک چلے جاتے۔ (Ethico Religious Concepts in Quran: p.241)۔ حد سے بڑھے ہوئے اس احساس تفاخر کی بنا پر یہ لوگ کسی معمولی دھمکی کے جواب میں تشدد پر اتر آتے۔ وہ صرف اپنا دفاع ہی نہ کرتے بلکہ حملہ کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ ''شیر کی طرح خوفناک جنگ جو کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ دشمن پر جوابی حملہ کر کے اسے کاری ضرب لگانے والے حریف کے خلاف کارروائی کرے۔'' زہیر ابن ابی سلمٰی چلا اٹھا: ''بلکہ اسے حملہ کرنے میں پہل کرنی چاہیے اور دشمن کے خلاف جارحانہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔''

(زہیر ابن ابی سلمٰی: اشعار ۳۸، ۳۹: Ethico Religious Concepts in Quran: p.84)۔

قبیلے کا شاعر جب کسی کی جواں مردی اور بہادری کی تعریف کرتا تو اس سے خانہ بدوشوں میں ناقابل مزاحمت جوش و خروش اور ہیجان پیدا ہو جاتا۔ اگر قبیلے کے کسی فرد کے ساتھ زیادتی ہوتی تو کریم شخص اس کا بدلہ لینے کو اپنا فرض سمجھتا اور ظالم کو جسمانی تشدد کے علاوہ مزید ایذا رسانی کے لیے اسے بھوکا پیاسا رکھتا۔ (Ethico Religious Concepts in Quran: p.93)۔ یہ ایک المناک فلسفہ حیات تھا۔ صحرا نورد اپنی سخت کوشی کے جوہر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی نہایت سنگدلانہ تھی اس میں بہتری کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تمام مخلوقات دہر (وقت یا تقدیر) کے اختیار میں ہیں جو بنی نوع انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ انسان کی زندگی پہلے سے متعین ہے۔ ہر ذی روح کا

Marfat.com

انجام آخر کار فنا ہے یہاں تک کہ کامیاب جنگ جُو کو بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہے جس کے بعد وہ بھولی بسری داستان بن جائے گا۔ کبھی ختم نہ ہونے والی جدوجہد سے عبارت یہ زندگی بے کار محض ہے۔ اس حوصلہ شکن مایوسی کا واحد علاج پر تعیش زندگی ___ خاص طور پر شراب سے مدہوشی اور خود فراموشی ہے۔

ماضی میں کئی خانہ بدوشوں نے صحرا کی زندگی کو ترک کر کے زیادہ محفوظ آبادیوں میں رہنے کی کوشش کی لیکن پانی اور قابل کاشت زمین کی شدید قلت اور قحط کے باعث یہ کوششیں عموماً ناکام ہوئیں۔ (Ethico Religious Concepts in Quran: pp.17-20)۔ جب تک فاضل دولت جمع نہ ہوتی جو ایک ناممکن بات تھی، یا ثقیف قبیلے کی طرح طائف جیسے نخلستان پر قبضہ نہ کر لیا جاتا، کوئی بھی قبیلہ مستقل آبادی نہیں بسا سکتا تھا۔ دوسرا متبادل طریقہ یہ تھا کہ علاقے میں موجود دو یا اس سے زیادہ دولت مند تہذیبوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کیا جاتا۔ مثال کے طور پر غسان کا قبیلہ، جو سردیوں کا موسم بازنطینی سلطنت کی سرحد پر گزارتا تھا، یونانیوں کا حاشیہ نشین بن کر عیسائیت اختیار کر چکا تھا اور انہوں نے بازنطینیوں کا فارس سے تحفظ کرنے کی غرض سے دونوں بڑی سلطنتوں کے درمیان بفر ریاست قائم کر لی تھی۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے دوران ذرائع آمدورفت میں انقلاب آجانے کے نتیجے میں ایک نیا موقع پیدا ہو گیا۔ خانہ بدوشوں نے ایک ایسا کجاوا تیار کر لیا جس کی بدولت اونٹ پہلے سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھا لیتے اور ہندوستان، مشرقی افریقا، یمن اور بحرین کے تاجروں نے مال برداری کے لیے گدھا گاڑیوں کے بجائے اونٹ استعمال کرنا شروع کر دیے جو ریگستان میں کئی دن تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اشیائے تعیش کے غیر ملکی تاجروں نے عرب کو نظر انداز کرنے کے بجائے صحرائے عرب کو پار کر کے بازنطین اور شام کے ساتھ عود، لوبان، گرم مسالے، ہاتھی دانت، اناج، ہیرے جواہرات، لکڑی، کپڑے اور دوائیوں کی تجارت شروع کر دی۔ وہ اپنے تجارتی قافلوں کے لیے سیدھا روٹ استعمال کرنے لگے اور سامان تجارت کی حفاظت، اونٹ چلانے اور ایک سے دوسرے کنویں تک رسائی کے لیے خانہ بدوشوں کی خدمات حاصل کر لیں۔

شمال کی طرف جانے والے ان کاروانوں کے لیے مکہ کو ایک مستقل مستقر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حجاز کے وسط میں واقع اس شہر سے آسانی کے ساتھ رسائی ممکن تھی اور اگرچہ مکہ کا شہر ٹھوس پتھروں پر تعمیر ہوا تھا جس کی وجہ سے وہاں کھیتی باڑی ناممکن تھی، اس کے باوجود زیر زمین پانی کی موجودگی کے باعث، جسے عرب زم زم کے نام سے موسوم کرتے، یہ شہر قابل عمل اور مستقل طور پر دیرپا رہائش کے لیے موزوں تھا۔ اس بنجر اور ویران علاقے میں اس معجز آفریں اور حیرت انگیز چشمے کے دریافت ہونے کے بعد خانہ بدوش مکہ شہر کی ترقی سے بہت پہلے اسے ایک متبرک مقام سمجھتے تھے۔ پورے عرب سے زائرین مکہ میں گرینائٹ سے بنی صندوق نما عمارت کا طواف کرتے۔ پانچویں اور چھٹی صدی میں خانہ کعبہ کی تولیت جرہم اور خزاعہ قبیلوں کے پاس رہی۔ آخر چھٹی صدی کے شروع میں

Marfat.com

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قبیلہ قریش خانہ کعبہ کا متولی بن گیا۔ انہوں نے اپنے پیشروؤں کو مکہ سے نکال باہر کیا اور کعبۃ اللہ کے اردگرد سب سے پہلے مستقل عمارتیں تعمیر کرائیں۔

قریش کا جدِ امجد قصی ابن کلاب تھا۔ مکہ جب طویل مسافت کی تجارت کے مرکز کی حیثیت اختیار کر رہا تھا تو اس نے کئی قبیلوں کو، جن کے ساتھ اس کے خونی اور شادی کے ذریعے رشتے قائم تھے اور جو اس سے پہلے آپس میں جنگ و جدال کرتے تھے، مکہ میں لا کر ایک نئے قبیلے کی بنیاد رکھ لی۔ قریش کا لفظ غالباً تقرش (متفرق ہونے کے بعد پھر ایک جگہ جمع ہونے والے) سے ماخوذ ہے۔ جرہم اور خزاعہ قبیلوں کے برعکس، جنہوں نے بدوی زندگی کو ترک نہیں کیا تھا، قریش نے فاضل سرمایہ جمع کر کے آباد طرز زندگی کو ممکن بنا دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے شمال جنوب کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کر لی جس کے نتیجے میں غیر ملکی تجارتی قافلوں کی خدمات انجام دینے کا کام بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔ قریش نے عرب کے اندر تجارتی سرگرمیوں پر بھی کنٹرول حاصل کر لیا جو بین الاقوامی تجارت کے باعث تیز ہو گئی تھیں۔ چھٹی صدی کے ابتدائی حصے میں خانہ بدوش قبیلوں نے آپس میں اشیا کا تبادلہ شروع کر دیا تھا۔ مختلف منڈیوں میں تاجروں کے باضابطہ اجتماع اور عرب کے مختلف حصوں میں ہر سال تجارتی میلے منعقد ہونے لگے۔ یہ بازار اس قدر باقاعدگی سے لگتے کہ تاجروں نے پورے جزیرہ نما کو گھڑی کی سوئیوں کی طرح گھیرے میں لے لیا۔ اس نوعیت کا پہلا سالانہ بازار (سوق) کثیر آبادی کے علاقے بحرین میں لگا۔ اس کے بعد اومان اور یمن اور پھر مکہ کے نواح میں یکے بعد دیگرے پانچ میلے لگے۔ سال کا آخری میلہ حج کے مہینے سے تھوڑی دیر پہلے عکاظ میں اس وقت لگا جب زائرین خانہ کعبہ کی زیارت و اکرام کے لیے مکہ آنے والے تھے۔

چھٹی صدی کے نصف اول میں قریش نے اپنے تجارتی کارواں شام اور یمن بھیجنا شروع کر دیے اور آزاد تاجروں کی حیثیت سے بتدریج اپنا لوہا منوا لیا۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود وہ جانتے تھے کہ وہ اب بھی کمزور اور غیر محفوظ ہیں۔ چونکہ مکہ میں کاشتکاری ممکن نہیں تھی، اس لیے انہیں اشیا کے تبادلے پر مکمل انحصار کرنا پڑتا۔ چنانچہ اگر ان کی معیشت ناکام ہو جاتی تو وہ بھوکے مر جاتے۔ اس وقت قریش کا ہر شخص بینکار، ساہوکار یا بیوپاری کی حیثیت سے تجارت پیشہ بن گیا تھا۔ زرعی بستیوں میں خانہ بدوش زندگی کی روح برقرار رہی کیونکہ اس کی طرف ان کا فطری میلان تھا۔ دوسری جانب قریش تجارتی ماحول میں رچ بس گئے تھے جو انہیں ''مروہ'' کی بہت سی روایتی اقدار سے دور لے گیا تھا۔ مثال کے طور پر وہ اس لیے پرامن ہو گئے تھے کیونکہ صحرا نوردی کی اہم خصوصیت، جنگ و جدل کے باعث کاروبار ناممکن ہو جاتا۔ اب مکہ کو ایک ایسا شہر بنانا ناگزیر ہو چکا تھا جہاں ہر قبیلے کے تاجر حملے کے خطرے سے بے خوف ہو کر آزادانہ طور پر اکٹھے ہو سکتے۔ چنانچہ قریش نے قبائلی لڑائی میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ پالیسی پر کاربند رہنے کا پختہ عزم کر لیا۔ ان کی مکہ آمد

Marfat.com

سے پہلے زم زم اور کعبے کے اردگرد اکثر خونیں لڑائیاں ہوتی رہتیں کیونکہ حریف قبائل ان مقدس مقامات پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔اب قریش نے نہایت مہارت کے ساتھ بیس میل قطر کے علاقے میں حرم قائم کر دیا جس کا مرکز کعبہ تھا اور جہاں ہر قسم کے تشدد کی ممانعت کر دی گئی تھی۔انہوں نے بدو قبیلوں کے ساتھ خصوصی معاہدے کر لیے جنہوں نے تجارتی میلوں کے موسم میں کاروانوں پر حملے نہ کرنے کا یقین دلا دیا۔اس کے بدلے میں ان بدو اتحادیوں سے اس مالی نقصان کی تلافی کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ تاجروں کے گائیڈ اور محافظ کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔

مکہ میں تجارت اور مذہب ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ تھے۔مکے کا حج تجارتی میلوں کا نقطہ عروج تھا۔ چنانچہ قریش نے خانہ کعبہ کی عمارت کو از سر نو تعمیر کیا تا کہ یہ معبد تمام عرب قبائل کے لیے روحانی مرکز بن جائے۔خانہ بدوشوں کو دیویوں اور دیوتاؤں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن ہر قبیلہ خانہ کعبہ میں اپنا اپنا پتھر رکھ دیتا تھا اور جب وہ ان پتھروں کی عزت و تکریم کرتے تو وہ ناپختہ انداز میں ان کی پوجا نہ کرتے بلکہ ان پتھروں کو معبود حقیقی کا مرکز نگاہ تصور کرتے۔قریش کی کامیابی اور بقا کے لیے کعبے کی حرمت کو برقرار رکھنا ضروری تھا اور ان کے حریف بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔چنانچہ حبشہ اور یمن کے گورنر نے زائرین اور تاجروں کی توجہ قریش سے ہٹانے کے لیے صنعا میں ایک متبادل معبد تعمیر کر لیا۔پھر ۵۴۷ عیسوی میں اس نے یہ ثابت کرنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کر دی کہ مکہ شہر بہ ہر حال جنگ و جدال سے محفوظ و مامون نہیں ہے۔لیکن کہا گیا ہے کہ اس کا ہاتھی جب مکہ کے قریب پہنچا تو گھٹنوں کے بل گر پڑا اور اس نے حرم پاک پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔اس معجزے کو دیکھ کر ابرہہ کی فوج واپس چلی گئی۔چنانچہ ہاتھیوں کا سال مکہ کے تقدس اور حرمت کی علامت بن گیا۔(کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔سورہ الفیل۔مترجم)۔

لیکن خانہ کعبہ میں یہ پرستش محض عبادت کا روکھا سوکھا اظہار نہیں تھا بلکہ مناسک حج کی ادائیگی عرب زائرین کے لیے عمیق سطح پر ایک روح پرور تجربہ تھا۔جب وہ تجارتی میلوں کے آخر میں مکہ کا رخ کرتے، اس وقت وہ کامیابی اور ہیجان انگیز کیفیت سے سرشار ہوتے۔قریش ان کے کاروانوں کی جانچ پڑتال کرتے جس کے بعد اونٹوں سے سامان اتار لیا جاتا۔پھر تاجر ایک معمولی فیس ادا کرتے جس کے ساتھ ہی تاجروں اور ان کے ملازموں کو حرم کعبہ کی زیارت کرنے کی اجازت دے دی جاتی۔جب وہ مکہ کی تنگ گلیوں سے گزرتے تو وہ بلند آواز سے روایتی کلمات ادا کرتے جس کا مقصد ان دیوتاؤں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا تھا جو ان کی آمد

Marfat.com

کا انتظار کر رہے ہوتے۔ جزیرہ نما عرب کے گرداگرد طویل سفر طے کرنے کے بعد اپنے قبیلے کے پرانے مقدس دیوتاؤں کے ساتھ دوبارہ ملاقات کر کے انہیں یوں طمانیت حاصل ہوتی جیسے وہ اپنے گھر میں واپس آ گئے ہیں۔ جب وہ ۳۶۰ قبائلی مورتیوں سے گھرے خانہ کعبہ کے قریب پہنچتے تو مکہ اور اس کے قرب و جوار میں وہ مخصوص مناسک ادا کرنا شروع کر دیتے جن کا مقصد یہ تھا کہ سورج دیوتا کو اس قدر دق کر دیا جائے کہ وہ موسم سرما کی بارش برسانے پر مجبور ہو جائے۔ پھر یہ لوگ اکٹھے ہو کر گرج چمک کے دیوتا کی قیام گاہ مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جاتے اور مکہ سے کوئی سولہ میل دور جبلِ عرفات کے گرد واقع میدانی علاقے میں پوری رات گزارتے، منیٰ میں تین ستونوں پر کنکریاں مارتے اور آخر میں قیمتی اونٹوں کی قربانی دیتے جس سے ان کی دولت کا اظہار ہوتا۔

حج کا سب سے مشہور رکن طواف تھا۔ زائرین گھڑی کی سوئیوں کے رخ میں سات مرتبہ کعبۃ اللہ کا طواف کرتے۔ اس کی مثال عرب کے گرد گول دائرے میں تجارتی روٹ کی سی تھی جس نے تجارتی سرگرمیوں کو روحانی جہت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ خانہ کعبہ کے طواف کو ایک مقدس اور مقبول مشق کا درجہ حاصل تھا اور مکہ کے باشندے اور باہر سے آنے والے زائرین سارا سال طواف کا سلسلہ جاری رکھتے۔ حرم کعبہ کی عمارت کو فن تعمیر کے اس اولیں نمونے کی حیثیت حاصل تھی جو قدیم دنیا کے دوسرے شہروں میں تعمیر ہونے والے معبدوں میں بے مثل اہمیت کی حامل تھی۔ (Johanne Slock: Devotional Language, pp.89-90)۔

کعبۃ اللہ کی عمارت کے چار کونے چار سمتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کعبے کے مشرق کی جانب ایک سیاہ پتھر (حجرِ اسود) ایستادہ ہے۔ یہ شہابی پتھر آسمان سے گرا تھا اور اسے زمین اور جنت کے درمیان تعلق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، اسی طرح زائرین گرینائٹ کی اس صندوق نما عمارت کے گرد ہچکولے کھاتے ہوئے اس کا طواف کرتے ہیں اور اس عمل کے نتیجے میں وہ تخلیق کائنات کے بنیادی نظام سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ خانہ کعبہ کا طواف کلیت کی عمومی علامت ہے۔ اس طرح آپ اسی جگہ واپس آ جاتے ہیں جہاں سے آپ نے طواف شروع کیا تھا۔ اس سے گردش اور باقاعدگی کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ کعبے کے گرد بار بار طواف کرنے سے زائرین کو داخلی مرکز اور حقیقی سمت کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے، سطحی خیالات بتدریج ذہن سے نکل جاتے ہیں اور ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مذہب کی اصلاح شدہ رسوم نے مکہ کو عرب کا مرکز بنا دیا۔ جب دوسرے زائرین کو اپنے وطن میں واپس جانے کے لیے طویل سفر طے کرنا پڑتا تو عربوں کو جزیرہ نما چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی چنانچہ دنیائے عرب نے اپنی تمام تر توجہ مکہ پر مرکوز کر دی۔ (Bamyeh: Social Origins of Islam: p.32)۔ مکہ شہر ایک الگ تھلگ مقام پر واقع تھا جس کی بنا پر عربوں کو غیر معمولی آزادی حاصل تھی۔ علاقے کی دونوں بڑی طاقتوں

Marfat.com

فارس اور بازنطینیوں کو عرب کے اس دشوار گزار خطے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ قریش کسی شاہی کنٹرول کے بغیر خود ایک جدید معیشت کو معرض وجود میں لا سکتے تھے۔ دنیا مکہ سے گزر جاتی لیکن مداخلت کے لیے زیادہ دیر تک وہاں نہ رکتی۔ عرب خود اپنا نظریہ حیات وضع کر سکتے تھے اور ان میں اپنے زیادہ مہذب ہمسایوں کے علم اور تجربے کی بہتر انداز میں توضیح کرنے کی استعداد موجود تھی۔ کسی بیرونی مذہب یا سرکاری عقائد کو قبول کرنے کے لیے ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ تجارتی گردش اور حج کی قدیم رسوم کے گہرے اثر سے خود کفالت کے باعث ان میں ایک واضح احساس تفاخر موجود تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی احساس شہری کلچر کا طرۂ امتیاز بننے والا تھا۔

بڑی طاقتوں سے علیحدگی کا مطلب یہ تھا کہ ان طاقتوں کے زوال سے مکہ کی معیشت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال قریش کے لیے سودمند تھی۔ ۵۷۰ عیسوی تک، جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی پیدائش کا سال ہے، فارس اور بازنطین نے ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی کوشش میں لڑائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا تھا جس کے نتیجے میں دونوں سلطنتوں کو تباہ کن نقصان اٹھانا پڑا۔ شام اور عراق میدان جنگ بن گئے اور کئی تجارتی شاہراہوں کو ترک کر دیا گیا۔ چنانچہ مکہ نے شمال اور جنوب کے درمیان پوری تجارت پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ (Social Origins of Islam: p.43)۔ عالمی طاقتوں کی محاذ آرائی سے قریش پہلے سے زیادہ طاقتور بن گئے، اس کے باوجود ان میں سے بعض لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی کامیابی کی بہت زیادہ قیمت ادا کر رہے ہیں۔ چھٹی صدی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی کہ مکہ ایک شدید روحانی اور اخلاقی بحران کی گرفت میں آ گیا۔

مسابقت کی معیشت کے باعث پرانا گروہی جذبہ سرد ہو گیا کیونکہ اس نظام کا دارومدار سنگدلانہ مقابلے، لالچ اور انفرادی کاروبار پر تھا۔ مختلف خاندان دولت اور وقار کے لیے ایک دوسرے کو حریفانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جو قبیلے اور خاندان زیادہ کامیاب نہیں تھے، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ لوگوں نے دولت کو فیاضی اور کشادہ دلی سے خرچ کرنے کے بجائے اسے جمع کرنا اور نجی خزانے بھرنے شروع کر دیے۔ وہ نہ صرف قبیلے کے ناداروں اور بے کسوں کو نظر انداز کرنے لگے بلکہ انہوں نے یتیموں اور بیواؤں کے حقوق غصب کرنا اور ان کی املاک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ فطری طور پر نئی خوشحالی پر مسرور تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی دولت نے انہیں خانہ بدوش زندگی کی محرومیوں اور بدنصیبیوں سے بچا لیا ہے۔ لیکن جو لوگ مالی کامیابی کی دوڑ میں کچلے گئے اور پیچھے رہ گئے، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ خسارے میں رہے ہیں۔ ''مروہ'' کے اصول منڈی کی قوتوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور کئی لوگوں کو اس گہرے روحانی خلا کا شدت سے احساس تھا۔ پرانی اعلیٰ قدروں کی جگہ متبادل مساوی اقدار کو فروغ نہ دیا گیا

Marfat.com

چنانچہ قدیم گروہی کلچر نے ان پر واضح کر دیا کہ یہ ہلاکت خیز انفرادیت پسندی قبیلے کے لیے مضرت رساں ہے حالانکہ ان کی بقا قبیلے کے تمام افراد کے تمام وسائل کو یک جا کرنے میں مضمر تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ کے انتہائی ممتاز گھرانے بنی ہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کے پڑدادا ہاشم سب سے پہلے تاجر تھے جنہوں نے شام اور یمن کے ساتھ خود مختار حیثیت میں تجارت کی تھی۔ حج کے زمانے میں یہی خاندان حاجیوں کو پانی پلاتا اور مکہ میں یہ ایک ممتاز منصب تھا۔ لیکن حال ہی میں بنی ہاشم کی مالی حالت خراب ہوگئی تھی۔ حضورؐ کے والد عبداللہ آپؐ کے پیدا ہونے سے پہلے وفات پا گئے اور آپؐ کی والدہ ماجدہ آمنہ اس قدر مشکل حالات سے دوچار تھیں کہ خانہ بدوش عورتوں میں جو واحد خاتون آں حضرتؐ کی دایہ بنی، اس کا تعلق عرب کے بے حد غریب قبیلے سے تھا۔ حضورؐ چھ سال کی عمر تک حلیمہ کے گھرانے میں رہے جہاں آپؐ نے بدوی زندگی کا تلخ ترین زمانہ گزارا۔ جب آپؐ کو واپس مکہ لایا گیا تو آپؐ کی والدہ انتقال کر گئیں۔ اس دہرے صدمے نے آں حضرتؐ پر گہرا اثر چھوڑا چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ رسول اللہؐ کو یتیموں کی حالت پر ہمیشہ تشویش رہی۔

حضورؐ کے رشتے داروں نے آپؐ کے ساتھ نہایت شفقت آمیز سلوک کیا۔ والدہ کی وفات کے بعد آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کے پاس رہنے لگے جو اپنے زمانے میں بے حد کامیاب تاجر رہے تھے۔ بوڑھے عبدالمطلب کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ عبدالمطلب کے لیے کعبۃ اللہ کے زیر سایہ فرش بچھایا جاتا تھا اور ان کے بیٹے فرش کے اطراف میں بیٹھے رہتے۔ بیٹوں میں سے کوئی بھی والد کی عظمت کے لحاظ سے فرش پر نہ بیٹھتا تھا لیکن رسول اللہؐ جب تشریف لاتے تو دادا کے ساتھ فرش پر بیٹھ جاتے اور عبدالمطلب آپؐ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے رہتے۔ عبدالمطلب کا انتقال ہوا تو حضورؐ کی عمر آٹھ سال تھی لیکن آپؐ کو ورثے میں کچھ نہ ملا۔ آں حضرتؐ کے زیادہ طاقت ور رشتے داروں نے آپؐ کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ آپؐ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ رہنے لگے جو اب بنی ہاشم کے سید (سردار) تھے تاہم اب ان کا کاروبار روبہ زوال تھا۔ ابوطالب اپنے بھتیجے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان کے بھائیوں نے بھی حضورؐ کی تعلیم و تربیت میں ان کی امداد کی۔ حضرت حمزہؓ نے، جو حیرت انگیز طور پر قوی تھے، آپؐ کو عسکری تربیت دی اور آپؐ کو ایک ماہر تیر انداز اور بہترین شمشیر زن بنا دیا۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے، جو ایک بینکار تھے، حضورؐ کو شمال کی جانب شام جانے والے تجارتی قافلوں کا انتظام کرنے کا کام دلوا دیا۔

نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں بے حد مقبول تھے۔ آپؐ نہایت خوبصورت تھے۔ نہ دراز قامت تھے، نہ آپؐ کا قد پستہ تھا بلکہ میانہ قامت لوگوں میں سے تھے۔ آپؐ کے بال سیدھے اور گھنگریالے

۱۴۴۹۷

Marfat.com

تھے، سفید رنگ میں سرخی کی جھلک تھی، سرگیں آنکھیں، سینے سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر، ہتھیلیاں اور تلوے پر گوشت، تیز رفتار تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نشیب کی جانب چل رہے ہیں۔ جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پوری توجہ کرتے۔ سخاوت میں سب سے سخی، جرأت و بہادری میں سب سے زیادہ قوی دل، گفتار میں سب سے سچے، سب سے نرم طبیعت اور سب سے زیادہ کریمانہ اخلاق! آپؐ کا چہرہ مبارک روشن و تاباں اور مسکراہٹ حد درجہ پرکشش تھی جس کا تمام ذرائع نے تذکرہ کیا ہے۔ حضورؐ کا ہر عمل فیصلہ کن تھا اور آپؐ جو کام کرتے، اسے دل و جان سے انجام دیتے۔ آپؐ ہر کام پر پوری توجہ دیتے، کبھی شانے سے اوپر نہ دیکھتے خواہ آپؐ کا چوغہ کسی خاردار جھاڑی میں کیوں نہ الجھ گیا ہو۔ رسول کریمؐ جب کسی کے ساتھ گفتگو کرتے تو آپؐ کا روئے مبارک مخاطب کی طرف ہوتا۔ آپؐ جب کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک دوسرا شخص ہاتھ نہ چھوڑتا، آپؐ اپنا ہاتھ واپس نہ لے جاتے۔ مکہ میں آپؐ امین یا قابل اعتماد شخص کے لقب سے مشہور تھے تاہم ایک یتیم ہونے کے ناتے آپؐ کو وہ مقام نہ دیا جاتا جس کے آپؐ مستحق تھے۔ آں حضرتؐ اپنے چچا کی بیٹی فاختہ سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ابوطالب نے یہ کہہ کر اپنی بیٹی کو حضورؐ کے ساتھ بیاہنے سے انکار کر دیا کہ آپؐ ایک بیوی کی کفالت نہیں کر سکتے چنانچہ انہوں نے فاختہ کی شادی ایک ایسے خاندان میں کر دی جو ان کے لیے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عمر ۲۵ سال تھی تو آپ کی قسمت اچانک تبدیل ہو گئی۔ حضورؐ کی دور کی رشتے دار خدیجہؓ بنت خویلد نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ ان کا ایک تجارتی قافلہ شام لے جائیں۔ ان کا تعلق اس قبیلے سے تھا جو بنی ہاشم کے مقابلے میں زیادہ بااثر تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ ایک کامیاب تاجر بن گئی تھیں۔ شہری زندگی اعلیٰ طبقے کی خواتین کو کاروبار میں پھلنے پھولنے کے اکثر مواقع فراہم کرتی ہے تاہم مکہ میں نچلے طبقے کی عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ آں حضرتؐ اس مہم سے اس قدر کامیاب لوٹے کہ حضرت خدیجہؓ آپؐ سے بہت متاثر ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ کو عقد کا پیغام بھیج دیا۔ انہیں ایک شوہر کی ضرورت تھی اور ان کے باصلاحیت عزیز ان کے لیے موزوں انتخاب ثابت ہو سکتے تھے۔ ''اے میرے چچا کے بیٹے!'' جناب خدیجہؓ نے حضورؐ سے کہا: ''آپؐ سے رشتے داری، قوم میں آپؐ کے شرف، امانت داری، حسن اخلاق اور سچائی کی وجہ سے آپؐ کی جانب میرا میلان خاطر ہے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۲۰: The Life of Muhammad, p.82)۔ رسول اللہؐ کے بعض نکتہ چیں اس معمر لیکن دولت مند بیوہ کے ساتھ آپؐ کی شادی پر طنز کرتے ہیں اور اس جانب اشارہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے محض ذاتی مفاد کی خاطر حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کو ان سے دلی محبت تھی اور

Marfat.com

اگرچہ عرب میں کثیرالازدواجی کا دستور موجود تھا، اس کے باوجود آپؐ نے جناب خدیجہؓ کی زندگی میں کسی اور نوجوان خاتون کے ساتھ شادی نہ کی۔ حضرت خدیجہؓ ایک ممتاز اور نابغہ روزگار خاتون تھیں اور حضورؐ کے پہلے سیرت نگار محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ: ''خدیجہؓ ایک اولوالعزم، شریف اور عقل مند خاتون تھیں۔ دشمن جب بھی رسول اللہؐ پر حملہ کرتے یا آپؐ روحانی مشاہدے کی قوت سے مغلوب ہوتے تو اطمینان خاطر اور غم خواری کے لیے اپنی اہلیہ کے پاس جاتے۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اپنے شوہر کی بے مثل صلاحیتوں کا اعتراف کیا، آپؐ کی تقویت کا باعث بنیں، آپؐ کا بوجھ ہلکا کیا اور آپؐ کی صداقت کا برملا اعلان کیا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۵۵۔ The Life of Muhammad, p.111)۔ چونکہ آنحضرتؐ بچپن میں اپنی والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے اس لیے آپؐ جذباتی طور پر حضرت خدیجہؓ پر انحصار اور ان کے مشورے اور حمایت پر بھروسا کرتے۔ ان کی وفات کے بعد آپؐ ان کی حد درجہ تعریف و تحسین کر کے ازواج مطہراتؓ کو اشتعال دلاتے۔

جناب خدیجہؓ نے غالباً عمر کی تیسری دہائی کے آخر میں حضورؐ سے شادی کی تھی۔ ان کے بطن سے آپؐ کے کم سے کم چھ بچے پیدا ہوئے۔ آپؐ کے دو صاحبزادے القاسمؓ اور عبداللہؓ کم سنی میں وفات پا گئے البتہ آپؐ کی چار صاحبزادیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ زندہ رہیں۔ آں حضرتؐ اگرچہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں میں بانٹ دیتے تھے، اس کے باوجود یہ ایک خوش و خرم گھرانا تھا۔ آپؐ دو حاجت مند لڑکوں کو بھی اپنے گھر لے آئے۔ شادی کے موقعے پر حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو ایک غلام لڑکا زید ابن الحارث ہدیے میں پیش کیا جس کا تعلق شمالی قبیلوں سے تھا۔ اسے اپنے نئے آقا کے ساتھ اس قدر محبت ہو گئی کہ جب اس کے خاندان نے اس کا سراغ لگا لیا اور اس کا باپ رہائی کے عوض رقم لے کر مکہ پہنچا تو زید نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہؐ نے زید سے کہا کہ تم چاہو تو میرے پاس رہو اور چاہو تو اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ لیکن زید نے کہا کہ میں آپؐ ہی کے پاس رہوں گا۔ حضورؐ نے زید کو آزاد کر کے اسے اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ چند برسوں کے بعد ابوطالب شدید مالی مشکلات میں گھر گئے تو آپؐ ابوطالب کا بوجھ کم کرنے کے لیے ان کے پانچ سالہ بیٹے علیؓ کو پرورش کی غرض سے اپنے گھر لے آئے۔ آں حضرتؐ ان دونوں لڑکوں سے بے حد محبت کرتے اور ان کے ساتھ اپنے بیٹوں جیسا سلوک کرتے تھے۔

ہمیں حضورؐ کے ان ابتدائی برسوں کے بارے میں بہت کم علم ہے لیکن بعد کے کیریئر سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے زمانے کی نوجوان نسل میں پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر لی تھی جو جارحانہ مسابقت کی معیشت کے باعث ذہنی آسودگی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ قریش نے مختلف لوگوں

Marfat.com

کے درمیان طبقاتی امتیاز روا رکھنے کی حکمت عملی اپنالی تھی جو ''مروہ'' کے نصب العین سے ہرگز لگا نہیں کھاتی تھی۔ جب انہوں نے مکہ پر کنٹرول حاصل کرلیا تو متمول قریش کعبہ کے قرب وجوار میں جب کہ کم خوش حال لوگ مکہ کے پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے خانہ بدوشی کی کشادہ دلی کی خصوصیات کو ترک کر کے کنجوسی اور بخل سے کام لینا شروع کر دیا اور اسے کاروباری ذہانت کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ بعض قریش تو یہ باور کرنے لگے کہ ان کی دولت انہیں امر کر دے گی۔ (بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا جائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔ سورہ الھمزہ آیات ۲،۳۔ مترجم)۔ کئی دوسروں نے یہ عقیدہ اپنا لیا کہ لذات دنیا ہی مقصد حیات ہیں چنانچہ انہوں نے لذت پسندی ہی کو اپنا ایمان بنا لیا۔ (اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ سورۃ الانعام، آیت ۷۰۔ جنہوں نے دنیا میں اپنے دین کو لہو ولعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ سورہ الاعراف آیت ۵۱۔ مترجم)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شدت کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگے کہ قریش نے ''مروہ'' کی اعلیٰ خصوصیات کو ترک کر کے اس کے صرف برے پہلوؤں، عاقبت نااندیشی، غرور اور خود بینی وخود پسندی کے خصائص کو اپنا لیا ہے جو اخلاقی اعتبار سے تباہ کن ہیں اور جن کی وجہ سے مکہ شہر کھنڈرات کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔ حضورؐ کو یقین تھا کہ سماجی اصلاح کی بنیاد نئے روحانی حل پر استوار ہونی چاہیے ورنہ ساری کوششیں سطحی اور مصنوعی ثابت ہوں گی۔ غالباً عمیق سطح پر آپؐ کو بھی احساس تھا کہ آپؐ اعلیٰ اوصاف سے متصف ہیں لیکن اصلاح احوال کے لیے آپؐ کیا کر سکتے ہیں؟ مکہ میں کوئی شخص سنجیدگی سے آں حضرتؐ کی دعوت پر توجہ نہیں دے رہا تھا کیونکہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی کے باوجود شہر میں آپؐ کی کوئی حقیقی حیثیت نہیں تھی۔

مکہ میں بڑے پیمانے پر روحانی اضطراب پایا جاتا تھا۔ حجاز کے قصبوں اور زرعی بستیوں میں مستقل رہنے والے عربوں نے ایک مختلف قسم کا مذہبی وژن دریافت کر لیا تھا۔ وہ خانہ بدوشوں کے مقابلے میں دیوتاؤں میں دلچسپی لینے لگے البتہ عرب میں ان کے توحید پرستی کے ابتدائی نظریے کی جڑیں زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔ انہوں نے مختلف معبودوں کے بارے میں چند افسانوی قصے کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اللہ کو سب سے اہم دیوتا اور خانہ کعبہ کا مالک تصور کیا جاتا تھا لیکن اس کی ذات بہت دور افتادہ تھی اور لوگوں کی روزمرہ زندگی پر اس کا بہت کم اثر تھا۔ دوسرے ''برتر دیوتاؤں'' یا ''آسمانی دیوتاؤں'' کی طرح، جو قدیم مذہب کی عمومی وضع قطع کے حامل تھے، اللہ کی کوئی صورت گری نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی کبھی اس کی کوئی شبیہ بنائی گئی تھی۔ (The Origins of the Ideas of God)۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اللہ نے دنیا تخلیق کی ہے، اس نے رحم مادر

Marfat.com

میں بچے کی پرورش کی اور وہی بارش برساتا ہے۔ لیکن یہ سب عقائد غیر مرئی اور قیاسی تھے۔ عرب ہنگامی صورت حال میں اللہ سے دعا کرتے لیکن جب خطرہ ٹل جاتا تو وہ اللہ کو بھول جاتے۔

وہ اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان سے خوش ہوتے ہیں اور ان پر ایک جھونکا سخت ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ (برے) آ گھرے۔ (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہم کو اس سے بچالے تو ہم ضرور شکر گزار بن جائیں گے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو بچالیتا ہے تو وہ فوراً ہی زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری یہ سرکشی وبال بننے والی ہے۔ دنیاوی زندگی کے چند فائدے ہیں، پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے، پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو بتلا دیں گے۔ پس دنیاوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے زمین کی نباتات، جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں، خوب گنجان ہو کر نکلی یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حکم (عذاب) آ پڑا سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا گویا وہ موجود ہی نہ تھی۔ ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔ (سورہ یونس آیات ۲۲ تا ۲۴۔ مترجم)۔

پس یہ لوگ جب کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لیے عبادت کو خالص کر کے۔ پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو اس وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔ (سورہ العنکبوت آیت ۶۵۔ مترجم)۔

کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ دریا میں کشتیاں اللہ کے فضل سے چل رہی ہیں اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے، یقیناً اس میں ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اور جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ (نہایت) خلوص کے ساتھ اعتقاد کر کے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ (باری تعالیٰ) انہیں نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچاتا ہے تو کچھ ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو بدعہد اور ناشکرے ہیں۔ (سورہ لقمٰن آیات ۳۱، ۳۲۔ مترجم)۔

کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ پھر تمہیں دریا کے سفر میں لے آئے اور تم پر تند و تیز ہواؤں کے جھونکے بھیج دے اور تمہارے کفر کے باعث تمہیں ڈبو دے، پھر تم اپنے لیے ہم پر اس کا دعویٰ

Marfat.com

(پیچھا) کرنے والے کسی کو نہ پاؤ گے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۹۔ مترجم)۔

اور اگر آپؐ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ آپؐ ان سے کہیے کہ اچھا یہ تو بتاؤ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ آپؐ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے۔ توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔ (سورہ الزمر آیت ۳۸۔ مترجم)۔

اگر آپؐ ان سے دریافت کریں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً یہ جواب دیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کہاں الٹے جاتے ہیں۔ (سورہ الزخرف آیت ۸۷۔ مترجم)۔

قریش کے مانوس کرنے کے لیے (یعنی) انہیں جاڑے اور گرمیوں کے سفر سے مانوس کرنے کے لیے (اس کے شکریے میں) پس انہیں چاہیے کہ اسی گھر کے رب کی عبادت کرتے رہیں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور ڈر (اور خوف) میں امن (وامان) دیا۔ (سورہ قریش آیات ۱ تا ۳۔ مترجم)۔

کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان روک بنا دی، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر کچھ جانتے ہی نہیں۔ بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت وعبرت حاصل کرتے ہو۔ کیا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھاتا ہے اور جو اپنی رحمت سے پہلے ہی خوشخبریاں دینے والی ہوائیں چلاتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے جنہیں یہ شریک کرتے ہیں، ان سب سے اللہ بلند و برتر ہے۔ (سورہ النحل آیات ۶۱ تا ۶۳۔ مترجم)۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ مردوں اور عورتوں کو تخلیق کرنے کے بعد اللہ کی حیثیت ایک غیر ذمے دار اور غیر حاضر باپ کی سی ہے اور یہ کہ اللہ کو اب انسانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی اور اس نے بنی نوع انسان کو ان کی تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ (God and Man in the Koran: pp.93-101, 24-129)۔

قریش دوسرے دیوتاؤں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ خانہ کعبہ میں ہبل نام کے دیوتا کا بت موجود تھا جسے سرخ رنگ کے ایک بڑے پتھر سے تیار کیا گیا تھا۔ (F.E. Peters: The Hajj, pp24-27)۔ اس کے علاوہ ہبل کی تین دیویاں بھی تھیں: لات، عزیٰ اور منات، جنہیں خدا کی بیٹیاں (بنات اللہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ دیویاں شہری آبادیوں میں بہت مقبول تھیں اور طائف، نخلہ اور قضید میں انہیں مکہ کے حرم جیسا مرتبہ حاصل تھا۔ اگرچہ ان دیویوں کا مرتبہ اللہ سے کمتر تھا تاہم انہیں اکثر اللہ کے ''ساتھی'' یا ''شریک'' کہا

Marfat.com

جاتا اور ان کا موازنہ ان خوبصورت کونجوں سے کیا جاتا جو پرندوں میں سب سے بلند پرواز ہیں۔ مکہ میں اگرچہ ان دیویوں کا کوئی بت نصب نہیں تھا تاہم قریش ان دیویوں سے محبت کرتے اور انہیں دور افتادہ اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے وسیلہ بناتے۔ جب وہ کعبہ کے گرد طواف کرتے تو بلند آواز سے یہ مناجات پڑھتے: ''لات، عزیٰ اور تیسری منات! یہ بلند مرتبت غرانیق ہیں، ہمیں ان کی سفارش کی توقع کرنی چاہیے۔''

-(Ibn Al-Kalbi: The Book of the Idols.)

بت پرستی نسبتاً ایک نئے مذہبی جذبے کی پیداوار تھی جسے مکہ کے ایک سردار نے شام سے درآمد کیا تھا اور جس کو یقین تھا کہ بت بارش برسائیں گے لیکن ہمیں اس بارے میں کچھ علم نہیں کہ دیویوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہا جاتا تھا، خاص طور پر ان حالات میں کہ عرب اپنے ہاں بیٹیوں کی پیدائش کو بدقسمتی سمجھتے تھے اور انہیں عموماً پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ عرب کے دیوتا اپنے پجاریوں کی کوئی اخلاقی رہنمائی نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قریش نے پتھر کی مورتیوں کو الوہیت کی ناکافی علامت قرار دینا شروع کر دیا تھا۔

-(Social Origins of Islam: pp.22-23)

لیکن اس کا متبادل کیا تھا؟ عرب یہودیت اور عیسائیت کے توحید پرستی کے عقیدے سے آگاہ تھے۔ یہودی غالباً فلسطین پر بابلی اور رومن حملوں کے بعد ایک ہزار سال پہلے ہجرت کر کے عرب میں آ بسے تھے۔ شروع شروع میں وہ شمال میں یثرب اور خیبر کی زرعی بستیوں میں آباد ہوئے۔ شہروں میں یہودی تاجر اور زرعی بستیوں میں یہودی خانہ بدوش پہلے سے موجود تھے۔ وہ اپنے مذہب پر کاربند رہے اور انہوں نے اپنے قبیلے بنا لیے لیکن وہ شادیاں کر کے مقامی باشندوں میں گھل مل گئے۔ وہ عربی زبان بولتے، ان کے نام عرب تھے اور انہوں نے عرب ہمسایوں کی طرز پر اپنا معاشرہ تشکیل دے دیا۔ کئی عربوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ چنانچہ یمن اور بازنطینی سلطنت کی سرحد پر عیسائیوں کی کئی بستیاں موجود تھیں۔ ملک کے تاجر کاروباری سفر کے دوران راہبوں اور تارک الدنیا عیسائیوں سے ملاقاتیں کر چکے تھے اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے قصوں اور جنت دوزخ اور روز قیامت کے نظریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ وہ ان کے آسمانی صحیفوں کی تعریف کرتے اور ان کی خواہش تھی کہ ان پر بھی مقدس الہامی کلام خود ان کی زبان میں نازل ہو۔

عرب لوگ اس زمانے میں یہودیت اور عیسائیت کو خصوصی مذاہب کا درجہ نہیں دیتے تھے کیونکہ یہ ان کے اپنے مذہب سے بالکل مختلف تھے۔ اصل میں یہودی اور عیسائی کی اصطلاح عام طور پر مذہبی حوالے کے بجائے قبائلی الحاق کے ضمن میں استعمال ہوتی تھی۔

-(Social Origins of Islam: pp.79-80, No god but God, pp 9-13)

Marfat.com

یہ مذاہب جزیرہ نما کے روحانی پیش منظر کا مسلمہ حصہ تھے اور انہیں عربوں کی روحانیت کے عین موافق سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی شاہی طاقت عربوں پر اپنا مذہب مسلط کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے عرب اپنی ضروریات کے مطابق کوئی بھی دین اختیار کرنے میں آزاد تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ وہی خدا ہے جس کی یہودی اور عیسائی پرستش کرتے ہیں چنانچہ عیسائی عرب بت پرستوں کے ساتھ خانہ کعبہ کا حج کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ حضرت آدمؑ نے جنت سے نکالے جانے کے بعد خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور ایک تباہ کن سیلاب کے بعد حضرت نوحؑ نے اس کی ازسرنو تعمیر کی تھی۔ قریش کو علم تھا کہ انجیل میں عربوں کو حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بتایا گیا ہے اور یہ کہ خدا نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ اسماعیلؑ کو ان کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کے ہمراہ اس ویرانے میں چھوڑ دیں۔ خدا نے ان سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اسماعیلؑ کی اولاد ایک عظیم قوم ہوگی۔ (کتاب پیدائش:۱۶)۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ ریگستان میں حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے ملے اور انہوں نے اس معبد کو دوبارہ دریافت کرلیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا اور حج کے لیے مناسک وضع کیے۔

ہر کوئی جانتا تھا کہ عرب اور یہودی آپس میں قرابت دار ہیں۔ جیسا کہ یہودی مورخ جوزفس Josephus (ایک سو عیسوی) نے شکایت کی ہے کہ عرب ۱۳ سال کی عمر میں بیٹے کا ختنہ کرتے ہیں کیونکہ ان کے جدامجد اسماعیلؑ کا، جو ابراہیمؑ کے گھر میں ان کی لونڈی ہاجرہؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، اسی عمر میں ختنہ کیا گیا تھا۔ (The Antiquities of the Jews)۔ عرب اس وجہ سے یہودیت یا عیسائیت اختیار نہیں کرتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کے رکن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش تبدیل مذہب کے نظریے سے آشنا نہیں تھے۔ ان کا مذہبی وژن وحدت نہیں، کثرت پر مبنی تھا۔ (Social Origins of Islam: pp 25-27)۔ ہر قبیلہ مکہ آکر اپنے دیوتا کی پرستش کرتا جو اللہ کے گھر کے جوار میں ایستادہ ہوتا۔ عرب مذہب کے پوشیدہ یا خفیہ نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے، نہ ہی وہ توحید کے کسی ایسے عقیدے پر کاربند تھے جو اصنام پرستی کے خلاف ہو۔ وہ اللہ کو، جس کے گرد کعبے میں بتوں کا جھرمٹ لگا ہوا تھا، اسی طرح ان گنت معبودوں کا حاکم وفرماں روا سمجھتے تھے جس طرح توریت اور انجیل کے بعض مصنف یہوا کو ''دوسرے تمام دیوتاؤں پر برتری اور فوقیت دیتے تھے۔'' (Psalm:135:5)۔

لیکن شہروں میں رہنے والے بعض عرب اس مشرکانہ نظریے سے مطمئن نہیں تھے اور ان کی خواہش تھی کہ عربوں کا اپنا نظریہ توحید رائج ہو۔ (Social Origins of Islam: pp.89-144: No god but God: pp 13-15: God and Mankind: pp.107-8)

Marfat.com

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پہلی وحی نازل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے حرم کی مذہبی زندگی سے قطع تعلق کرنا شروع کر دیا تھا۔ بعضوں نے اپنے قبیلے والوں کو بتایا کہ حجر اسود کے گرد مسلسل چکر لگاتے رہنا بے سود ہے۔ ''جو نہ تو دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے۔ نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔'' انہیں یقین تھا کہ عربوں نے ''اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین کو بگاڑ دیا ہے۔'' چنانچہ یہ لوگ حنیفیہ یعنی ''اصل دین'' کی طرف لوٹنے پر غور کرنے لگے۔ (محمد بن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۴۳:The Life of Muhammad)۔ یہ کوئی منظم گروہ نہیں تھا۔ دین حنیف کے متلاشی ان لوگوں کو پتھر کی مورتیوں کی پرستش کرنے سے نفرت تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ ہی واحد خدا ہے لیکن اللہ کے بارے میں سب کی تشریحیں جدا جدا تھیں۔ بعض لوگوں کو توقع تھی کہ ایک عرب پیغمبر آ کر حضرت ابراہیمؑ کے قدیم اور اصلی دین کو دوبارہ زندہ کرے گا جب کہ کئی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس تجدید کی کوئی ضرورت نہیں، لوگ خود ہی دین حنیفیہ کی طرف پلٹ جائیں گے۔ بعضوں نے مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے اور یوم قیامت کی تبلیغ شروع کر دی اور کئی ایک نے دین ابراہیمؑ کے دوبارہ قیام تک عبوری قدم کے طور پر عیسائیت یا یہودیت اختیار کر لی۔

دین حنیف کے پیروکاروں کا اپنے ہم عصروں پر بہت کم اثر تھا کیونکہ انہیں صرف ذاتی نجات سے دلچسپی تھی۔ وہ عربوں کی سماجی یا اخلاقی اصلاح کے آرزومند نہیں تھے اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات عموماً منفی تھے۔ انہوں نے کوئی نیا نظریہ تخلیق کرنے کے بجائے عام لوگوں کے نظریات اور رویوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لفظ حنیف اصل میں حنف سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے ''راہِ فرار اختیار کرنا۔'' وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں، اس کے بجائے انہوں نے منفی رویہ اپنا کر یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ انہیں کن چیزوں کو پسند نہیں کرنا چاہیے۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں پائی جانے والی اس تحریک سے عرب میں موجود گہرے روحانی اضطراب کی عکاسی ہوتی ہے۔ مکہ میں ان تین ممتاز حنیف کے ساتھ حضورؐ کے قریبی تعلقات تھے: عبیداللہ ابن جحش آپؐ کے پھوپھی زاد جب کہ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ ان دونوں افراد نے عیسائیت اختیار کر لی۔ تیسرے شخص زید ابن عمرو کو، جنہوں نے مکہ کے بت پرست مذہب پر شدید حملہ کیا، مکہ سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ وہ آں حضرتؐ کے نہایت قابل اعتماد ساتھی بن گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حنیفی حلقوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ آپؐ راہ حق کی تلاش میں ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ مکہ سے نکالے جانے سے ایک دن پہلے زید نے اپنی پیٹھ کو کعبے کا سہارا دیتے ہوئے کہا: ''اے گروہ قریش! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں زید بن عمرو کی جان ہے، آج میرے سوا تم میں سے کوئی شخص دین ابراہیمؑ پر نہیں رہا۔'' پھر وہ کہتے: ''یا اللہ! اگر میں جانتا کہ کون سا طریقہ تجھے زیادہ پسندیدہ ہے تو میں اسی کے مطابق تیری پرستش

Marfat.com

کرتا لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔'' (محمد بن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، The Life of Muhammad)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابھی ایک نیا حل تلاش کر رہے تھے۔ پچھلے چند برسوں سے آپؐ رمضان المبارک کے دوران جناب خدیجہؓ کے ہمراہ ہر سال گوشہ نشینی اختیار کر لیتے۔ اس عرصے میں آپؐ یک سو ہو کر عبادت کرتے اور اپنے ہاں آنے والے مسکینوں میں خیرات تقسیم کرتے۔ (F.E. Peters: Hajj, pp.39-40)۔ ہمیں ان قواعد (تخنث اور تحفف۔ مترجم) کے بارے میں بہت کم معلوم ہے البتہ بعض ماخذوں کے مطابق یک سو ہو کر عبادت کرنے کا سلسلہ حضورؐ کے دادا (عبدالمطلب۔ مترجم) نے شروع کیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ یہ عمل خدائے بزرگ و برتر کے سامنے دیر تک سجدہ ریز ہو کر سماجی مسئلے کا حل تلاش کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ (God and Man: p.148)۔ کعبۃ اللہ کا بار بار طواف کرنے کا بھی بظاہر یہی مقصد تھا۔ اس زمانے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے خواب دیکھنے لگے۔ آپؐ نیند میں جو خواب دیکھتے، وہ صبح صادق کی طرح روشن و تاباں ہوتے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۵۱: The Life of Muhammad, p.105)۔

تقریباً ۶۱۰ عیسوی میں رمضان کے مہینے میں آں حضرتؐ غار حرا میں سالانہ گوشہ نشینی کے ایام عبادت میں گزار رہے تھے کہ آپؐ پر حیران کن اور ڈرامائی حملہ ہوا۔ اس وقت آپؐ پر پہلی وحی کے جو الفاظ نازل ہوئے، حضورؐ کو یوں محسوس ہوا جیسے آپؐ کے وجود کی گہرائیوں سے نکلنے والے یہ الفاظ مکہ کو درپیش مسئلے کی جڑوں تک سرایت کر گئے ہیں:

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا
جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا
تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے
جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا
جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا
سچ مچ انسان تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے
اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا (تونگر) سمجھتا ہے
یقیناً لوٹنا تیرے رب کی طرف ہے (سورہ العلق آیات ۱ تا ۸)

ان قرآنی آیات میں قریش کے اس عقیدے کے دائرہ کار میں توسیع کی گئی کہ تمام انسانوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اس میں ''مروہ'' کے خود کفالت کے احساس تفاخر کو محض ایک سراب قرار دیا گیا کیونکہ نوع انسانی کا انحصار مکمل طور پر خدا پر ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ کوئی غیر حاضر یا دور افتادہ معبود نہیں بلکہ

Marfat.com

اس کا منشا یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان کرے تا کہ وہ اس کے ''قریب آ سکیں۔'' انسانوں کو چاہیے کہ وہ تکبر اور استغنا سے کام نہ لیں بلکہ ایک حقیر غلام کی طرح خدا کا قرب حاصل کریں۔ خدا نے حکم دیا ہے: ''اپنے سر کو زمین پر رکھ دو (سجدہ کرو) سورہ علق۔ مترجم)۔ اس سے مراد ایسا انداز اور طرزِ عمل اختیار کرنا ہے جو متکبر قریش کو ناگوار تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین ''مروہ'' کے بعض لازمی اصولوں کی شروع سے ہی مخالفت کرتا تھا۔

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد رسول اللہؐ ہوش میں آئے تو طویل جسمانی مشقت کی بنا پر آپؐ اس خیال سے سخت خوف زدہ ہو گئے کہ آپؐ کے پاس ایک جن آیا تھا۔ حضورؐ کی یہ حالت ہو گئی کہ آپؐ زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس مایوسی کے عالم میں آپؐ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا شروع ہو گئے تا کہ اپنے آپ کو وہاں سے گرا کر زندگی کا خاتمہ کر سکیں۔ لیکن اسی دوران نبی کریمؐ کو ایک اور مشاہدہ ہوا۔ آپؐ نے آسمان کے کنارے پر جبریلؑ کو ایک آدمی کی شکل میں دیکھا جن کے قدم افقِ سما میں تھے:

اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے
جو زور آور ہے۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا
اور وہ بلند آسمانوں کے کنارے پر تھا
پھر نزدیک ہوا اور اتر آیا
پس وہ دو کمانوں کے بقدر فاصلے پر رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم (سورہ النجم آیات ۵ تا ۹۔ مترجم)

رسول کریمؐ نے بعد میں اس مشاہدے کے متعلق فرمایا: ''میں آسمان کے جس کونے پر نظر ڈالتا ہوں، ان ہی کو اسی حالت میں دیکھتا ہوں۔ پس میں اسی حالت میں کھڑا رہا، نہ اپنے سامنے کی جانب بڑھتا ہوں اور نہ اپنے پیچھے کی طرف لوٹتا ہوں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۵۳: The Life of Muhammad)

یہ پیغام خداوندی کی حامل روح تھی جسے آں حضرتؐ نے بعد میں جبریلؑ کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن یہ فرشتہ آرٹ کا کوئی شاہکار یا حسین و جمیل مخلوق نہیں، حدِ ادراک سے پرے ہستی مطلق کا پرتو تھا جس کا کسی معمولی انسان یا خلائی مخلوق سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

حضورؐ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ہے چنانچہ آپؐ خوف زدہ ہو گئے۔ آپؐ پہاڑ سے نیچے اتر کر خوف اور دہشت کی کیفیت میں حضرت خدیجہؓ کے پاس چلے گئے۔ رسول اللہؐ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اس حال میں جناب خدیجہؓ کے پاس پہنچے کہ آپؐ پر کپکپی طاری تھی۔ آپؐ نے زور سے کہا: ''مجھے ڈھانپ دو!'' آں حضرتؐ خوف سے کانپ رہے تھے اور حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو بازوؤں میں تھام رکھا

Marfat.com

تھا۔خوف کودور کرنے کی غرض سے وہ آپؐ کودلاسہ دے رہی تھیں۔انہیں وحی کے بارے میں کوئی ابہام نہیں تھا چنانچہ انہوں نے حضورؐ سے کہا: ''یہ کوئی جن نہیں ہے۔خدا اس بندے کے ساتھ اس قدر بے رحمی اور سنگدلی سے ہرگز پیش نہیں آئے گا جو راست بازی کے ساتھ خدا کی خدمت کے لیے کوشاں ہے۔'' حضرت خدیجہؓ نے کہا: ''آپؐ اپنے عزیز واقارب کے لیے مہربان ہیں،ان کے آرام وآسائش کا خیال رکھتے ہیں،غریبوں اور بے کسوں کی امداد کرتے اور ان کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔آپؐ اپنی قوم میں وہ اخلاقی قدریں بحال کرنے کی جدوجہد کررہے ہیں جن سے وہ محروم ہوچکی ہے۔آپؐ مہمانوں کے ساتھ عزت وتکریم سے پیش آتے ہیں اور مفلوک الحال اور تنگ دست لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔میرے محبوب! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ،صفحہ۱۵۳: The Life of Muhammad)۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت خدیجہؓ کو غالباً ایک ایسے مذہب کی حقیقی ماہیت کا ادراک ہوگیا تھا جو مذہبی رسوم اور عبادات سے پرے عملی رحم دلی،خدا ترسی اور مسلسل اخلاقی جدوجہد کا متقاضی تھا۔

حضرت خدیجہؓ نے آں حضرتؐ کو دوبارہ یقین دہانی کرانے کے لیے اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے ساتھ مشورہ کیا جنہوں نے اہل کتاب کے صحیفوں کو پڑھ رکھا تھا اور جو اس معاملے میں ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ورقہ نے جناب خدیجہؓ سے یہ واقعہ سنا تو چلا کر کہنے لگا: ''قدوس! قدوس! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے،اے خدیجہ! اگر تم نے مجھ سے سچ کہا ہے تو ناموسِ اکبر جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتا تھا، وہ ان کے پاس آپہنچا اور بے شک وہ اس امت کے نبی ہیں۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ،صفحہ۱۵۴: The Life of Muhammad)۔ اگلی مرتبہ ورقہ کی حرم میں حضورؐ سے ملاقات ہوئی تو اس نے آپؐ کا ہاتھ چوم لیا اور آپؐ کو خبردار کیا کہ آپؐ کا کام آسان نہیں ہے۔ ورقہ کہنے لگا: ''اب آپؐ کو جھٹلایا جائے گا،تکلیفیں دی جائیں گی اور خارج البلد کیا جائے گا۔'' ورقہ معمر شخص تھا اور اسے اندازہ تھا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔کہنے لگا: ''لیکن اگر اسے وہ دن دیکھنا نصیب ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کے دین حق کی مدد کرے گا''۔پھر اس نے سر جھکا کر نبی کریمؐ کے سر مبارک کو بوسہ دیا۔آں حضرتؐ کو ورقہ کی یہ باتیں سن کر سخت دھچکا لگا اور آپؐ نے مایوسی کے عالم میں اس سے پوچھا کہ آیا آپؐ کی قوم آپؐ کو واقعی مکہ سے نکال دے گی۔اس پر ورقہ نے افسردگی سے جواب دیا کہ کسی نبی کی اس کی اپنی قوم میں عزت وتکریم نہیں کی گئی۔

خوف،اندیشوں اور ایذا رسانیوں کے خطرے کی فضا میں یہ ایک مشکل آغاز تھا۔لیکن قرآن کریم نے حضورؐ کے کوہِ حرا کے تجربے کو ایک مختلف انداز میں محفوظ کیا ہے جس میں جبریلؑ کی زمین پر آمد کے واقعے کو ٹھیک اسی طرح حیرت،امن اور سکون کی علامت قرار دیا گیا ہے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی حضرت مریمؑ کے رحم میں

Marfat.com

موجودگی کو اپنی روح پھونکنے اور تمام جہان کے لیے نشانی کہا گیا ہے:

اور وہ پاک دامن بی بی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور خود انہیں اور ان کے لڑکے کو تمام جہان کے لیے نشانی بنا دیا۔ (سورہ الانبیا آیت ۹۱۔ مترجم)۔

اس کتاب میں مریم کا واقعہ بھی بیان کر جب کہ وہ اپنے گھر کے لوگوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی جانب آئیں اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح (جبریلؑ) کو بھیجا پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ (سورہ مریم آیات ۱۶، ۱۷۔ مترجم)۔

یقیناً ہم نے اسے شب قدر میں نازل فرمایا

تو کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟

شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے

اس میں (ہر کام) کے انجام دینے کو اپنے رب کے حکم سے فرشتے اور روح (جبریل) اترتے ہیں

یہ رات سراسر سلامتی کی ہوتی ہے اور فجر کے طلوع ہونے تک (رہتی ہے) (سورہ قدر)

قرآن کریم کی اس سورت میں مذکر اور مونث، خاص طور پر ضمیروں کے حوالے سے معنی خیز دھندلا پن پایا جاتا ہے لیکن ترجمے میں اکثر یہ جوہر برقرار نہیں رہتا۔ قرآن مجید میں عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے: ''کیا تجھے معلوم ہے؟'' یا ''تجھے کیا معلوم!'' یہ ایک ایسا انداز تخاطب ہے جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ابتدائی سامعین کو انوکھا اور عجیب معلوم ہوا ہوگا جس سے انہیں یہ عندیہ ملتا کہ وہ ایک نئی اقلیم میں داخل ہونے والے ہیں جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب آں حضرتؐ غارِ حرا کے ڈرامے سے خود غائب ہو گئے اور رات (لیلہ) کو اس خاتون کی طرح، جو اپنے عاشق کا انتظار کر رہی ہوتی ہے، مرکزی اسٹیج کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیلۃ القدر نے آسمان اور زمین کے درمیان رابطے کا ایک نیا دور شروع کر دیا۔ یہاں آسمانی مجادلے کے حقیقی خوف اور دہشت کی جگہ اس امن نے لے لی ہے جس سے صبح صادق کی منتظر دنیا کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔

جرمن تاریخ دان روڈلف اوٹو (Rudolf Otto) بھی اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس نے اس مقدس راز کو نہایت ہیبت ناک لیکن مسحور کن قرار دیا ہے۔ وحی کا نزول ناقابل مزاحمت، فوری تاکید طلب اور دہشت انگیز تھا تاہم اس نے انسانوں کو مسرت وانبساط کے ساتھ ساتھ کامل ہم آہنگی اور تکلفات سے مبرّیٰ مکالمے کی لذت سے روشناس کرایا ہے۔ (Rudolf Otto: The Idea of the Holy: pp.12-40)۔ وحی کی سادہ الفاظ میں تشریح ممکن نہیں چنانچہ رسول کریمؐ نے اپنے مشاہدے کی پیچیدگی کے پیش نظر دوسروں کو پیغام خداوندی کے بارے میں بتانے کے سلسلے میں نہایت احتیاط سے کام لیا۔ غار حرا میں نزول وحی کے بعد آپؐ

Marfat.com

کوکئی اور خواب دکھائی دیے لیکن ہمیں ان کی تعداد کا صحیح علم نہیں۔ اور اس کے بعد جب یہ ربانی آواز خاموش ہو گئی تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وحی کا سلسلہ بند ہونے پر سخت پریشانی اور مایوسی ہوئی۔

یہ نہایت دل شکستگی کا زمانہ تھا۔ آپؐ کو بار بار یہ خیال گزرتا کہ کیا آپؐ صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں؟ یا خدا نے آپؐ کو تنہا چھوڑ دیا ہے؟ کیا کسی جن نے آپؐ کو گمراہ کیا ہے؟ یہ ایک ہولناک مصیبت تھی!

وحی کا سلسلہ دو سال کے لیے منقطع رہا لیکن اس کے بعد سورہ الضحیٰ نازل ہوئی جس میں خدا کی طرف سے روشن وتاباں اور بصیرت افروز یقین دہانی کرائی گئی:

قسم ہے چاشت کے وقت کی
اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے
نہ تو تیرے رب نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ وہ بیزار ہو گیا ہے
یقیناً تیرے لیے انجام آغاز سے بہتر ہوگا
تجھے تیرا رب بہت جلد انعام دے گا اور تو راضی (اور خوش) ہو جائے گا
کیا اس نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟
اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی؟
اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا؟
پس یتیم پر تو بھی سختی نہ کیا کر
اور نہ سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ
اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ

یہاں اللہ نے یہ یقین دلایا ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کو تنہا نہیں چھوڑا۔ خدا نے مردوں اور عورتوں کو بھی یاد دلایا ہے کہ وہ اس کے پیہم لطف وکرم اور فیاضی کی پیروی کریں۔ تمام انسان اس دنیا میں خدا کی رحمت اور محافظت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اور اب ان کا فرض ہے کہ وہ بھی یتیموں، ناداروں اور بے کسوں کی مدد کریں۔ جو بھی شخص بھوک، افلاس اور جبر وتعدی کا شکار رہا ہو، اسے کسی حالت میں دوسروں کو یہ ایذائیں نہیں پہنچانی چاہییں۔ سورہ الضحیٰ کے آخر میں نبی کریمؐ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپؐ قریش کے سامنے اس پیغام کا اعلان کر دیں۔ لیکن اس وقت کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ قریش دعوت اسلام کو سن کر کیا ردعمل ظاہر کریں گے؟

Marfat.com

دوسرا باب

جاہلیت

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خاموشی کے ساتھ اپنا مشن شروع کر دیا۔ آپؐ نے اپنے دوستوں اور اپنے اہل خانہ کی اس مختصر جماعت کو وحی کے بارے میں بتایا جو آپؐ کی پرجوش اور ہمدرد جاں نثار بن گئی تھی اور جسے یقین ہو گیا تھا کہ آپؐ ہی عرب کے وہ پیغمبر ہیں جن کا طویل عرصے سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ لیکن آں حضرتؐ یہ محسوس کرتے تھے کہ قریش میں سے بیشتر لوگوں کے لیے آپؐ کے پیغام کو قبول کرنا مشکل ہے۔ اللہ کی طرف سے بھیجے جانے والے تمام نبی بلند قامت شخصیتوں کے مالک اور اپنے اپنے معاشرے کے بانی اور جدِ امجد تھے۔ اب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے ساتھ حضورؐ کا موازنہ کیا جانے والا تھا! قریش نے آپؐ کو اپنی آنکھوں کے سامنے پلتے بڑھتے دیکھا تھا، وہ آپؐ کو بازار میں کاروبار کرتے اور دوسروں کی طرح کھاتے پیتے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے ''مروہ'' کی بہت سی خصوصیات اور اقدار کو ترک کر دیا تھا لیکن وہ اب بھی اشراف کی حکومت کے نظریے اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی گزارنے پر یقین رکھتے تھے اور انہیں یہ توقع تھی کہ خدا بنی ہاشم کے ایک ادنیٰ فرد کے بجائے کسی ممتاز گھرانے کے کسی نامور کریم شخص کو نبوت کے منصب پر فائز کرے گا۔ رسول کریمؐ نے جب ان سے کہا کہ وہ اپنی اس متکبرانہ آزادی کو ترک کر دیں جس سے ان کے آباء واجداد کی سنت کی خلاف ورزی ہوتی تھی تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ قریش کا ردعمل کیا ہوگا؟

دعوت اسلام مشن کے شروع میں ہی آں حضرتؐ کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا البتہ حضرت خدیجہؓ، آپؐ کی صاحبزادیوں، حضرت علیؓ اور زیدؓ نے آپؐ کی نئی پیغمبرانہ حیثیت کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا۔ اگرچہ

Marfat.com

حضورؐ کے چچا ابوطالب کو آپؐ سے دلی محبت تھی اور وہ آپؐ کی حمایت کرتے تھے لیکن انہیں یہ جان کر صدمہ ہوا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے آباء واجداد کے دین سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ رسول کریمؐ کی وجہ سے خاندان تقسیم ہونے لگا۔ آپؐ کے چچیرے اور پھوپھی زاد بھائیوں جعفر ابن ابی طالب، عبداللہ، عبیداللہ بن جحش اور ان کی بہن زینب نے اسلام قبول کر لیا لیکن آپؐ کے چچا عباس اور حمزہ مسلمان نہ ہوئے تاہم ان کی بیویاں اسلام لے آئیں۔ آں حضرتؐ کے داماد ابوالعاص نے، جن کی شادی حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے ساتھ ہوئی تھی، نئے دین پر غور کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اس سے آپؐ کو فطری طور پر پریشانی اور صدمہ ہوا۔ اس زمانے میں خاندان کی یک جہتی کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا اور کسی بھی عرب کی طرح رسول اللہؐ بھی اپنے قبیلے اور خاندان کے بزرگوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپؐ کو توقع تھی کہ قیادت اوپر سے آئے گی لیکن یہ نوجوان نسل تھی جس نے آپؐ کے پیغام پر لبیک کہی۔ نزول قرآن نے حضورؐ کو عمومی اور روایتی قواعد کو ترک کر دینے کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی۔ آپؐ کو علم تھا کہ آپؐ کے بیشتر پیروکاروں کا تعلق نچلے طبقے کے لوگوں سے ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد عورتوں، آزاد کردہ غلاموں اور نوکروں کی تھی۔ حضرت بلالؓ آخرالذکر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حبشہ سے آئے تھے اور ان کی آواز غیر معمولی طور پر بلند تھی۔ جب مسلمان حرم میں نماز کے لیے جمع ہوتے تو ''شہر کے نوجوان اور کمزور لوگ'' آں حضرتؐ کو گھیرے میں لے لیتے۔ (W. Montgomery Watt: Muhammad at Mecca: p.87)۔ حضورؐ ان لوگوں کو گرم جوشی سے اپنی مختصر جماعت میں شامل کر لیتے لیکن آپؐ کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا کہ مختصر لوگوں کی اس جماعت کی یہ تحریک آخر کس طرح کامیاب ہوگی؟ واقعہ یہ ہے کہ قریش کے بعض سرداروں نے، جنہیں ابھی تک نزول وحی کے متعلق کوئی علم نہیں تھا، حضورؐ سے یہ سوال کرنا شروع کر دیا کہ آپؐ نیچ ذات کے لوگوں کو اپنا رفیق کیوں بنا رہے ہیں؟

لیکن یہ سب لوگ ''کمزور'' محتاج اور بے نوا نہیں تھے۔ اس قبائلی اصطلاح سے مراد ادنیٰ قبائلی حیثیت تھی نہ کہ غربت۔ اس مرحلے پر رسول اللہؐ کے سب سے سرگرم اور پرجوش پیروکار آپؐ کے دوست عتیق ابن عثمان تھے جو اپنی کنیت ابوبکر کے نام سے مشہور تھے۔ (عربوں میں پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد ایک اعزازی لقب اختیار کرنے کا دستور تھا جسے کنیت کہتے تھے چنانچہ ابوبکر سے مراد ہے ''بکر'' کا باپ۔ اسی طرح ان کی بیوی کو ام بکر یعنی بکر کی ماں کہا جاتا۔ رسول کریمؐ کو ابوقاسم کی کنیت سے پکارا جاتا تھا)۔ ابوبکرؓ ایک کامیاب دولت مند تاجر تھے لیکن حضورؐ کی طرح ان کا تعلق بھی ایک ایسے ''کمزور'' گھرانے سے تھا جسے اس زمانے میں مشکلات کا سامنا تھا۔ محمد ابن اسحاق ہمیں بتاتے ہیں: ''ابوبکر محبوب، نرم اخلاق اور قریش میں بہترین نسب والے تھے۔ علم،

Marfat.com

تجارت اور حسن معاملت کے سبب سے قوم کے تمام افراد آپ کے پاس آتے جاتے اور آپ سے تعلقات رکھتے تھے۔انہیں خوابوں کی تعبیر بتانے میں بھی شہرت حاصل تھی۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ، صفحہ ۱۴۱ The Life of Muhammad: p.115)۔

نئی نسل کے بہت سے لوگ، جو مکہ کی جارحانہ سرمایہ داری سے پریشان تھے، مشورہ لینے کے لیے رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔کئی نوجوان اس ذاتی خطرے کی فوری اہمیت سے آگاہ تھے۔وہ اس خواب غفلت سے بیدار ہونے کے آرزومند تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے والدین سے اجنبیت محسوس کرنے لگے تھے۔ایک نہایت طاقتور قبیلے کے اہم ساہوکار کے بیٹے نے خواب میں دیکھا کہ اس کا باپ اسے آگ کے گڑھے میں پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن دو ہاتھوں نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔خواب سے بیدار ہونے پر اس نے محسوس کیا کہ یہ نجات دہندہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔(محمد ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر: ۶۸،۱،۴:

(Martin Lings: Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources, p.47)۔

ایک اور بااثر قبیلے عبد شمس کا ایک نوجوان یہ خواب دیکھنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا جس میں اس نے صحرا میں یہ بلند آواز سنی تھی: ''سونے والو، بیدار ہو جاؤ! مکہ میں ایک پیغمبر کا ظہور ہو چکا ہے۔'' (محمد ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر: ۳۷،۱،۴:Lings: Muhammad, p.47)۔ان دونوں نوجوانوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن پہلے نوجوان نے، جب تک ممکن ہوا، نئے دین کو باپ سے چھپائے رکھا جب کہ دوسرے نوجوان کے قبول اسلام سے اس کے قبیلے کے سردار، جو مکہ میں نہایت بااثر تھے، سخت ناراض ہو گئے۔

نزول وحی کے بعد مکہ شہر میں پائی جانے والی ایک بہت بڑی غفلت اور کوتاہی منظر عام پر آ گئی۔نوجوانوں اور بوڑھوں، امیروں اور غریبوں اور مردوں اور عورتوں کے درمیان کئی برسوں سے ایک پریشان کن تقسیم کا عمل شروع تھا۔یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایک ایک آیت اور ایک ایک سورت کی شکل میں جو وحی نازل ہو رہی تھی، اس میں اس قسم کی ناانصافی کی مذمت کی گئی تھی جس میں ایک طبقے کا دوسرے طبقے کے ہاتھوں نقصان اٹھانا ناگزیر تھا۔(یقیناً ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ تم سب اللہ کی عبادت کرو، پھر بھی وہ دو فریق بن کر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔آپ نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو! تم نیکی سے پہلے برائی کی جلدی کیوں مچا رہے ہو؟ تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کیوں نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔(سورہ النحل آیات ۴۵،۴۶۔مترجم)۔یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور وہاں کے لوگوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا اور ان میں سے ایک فرقے کو کمزور کر رکھا تھا اور ان کے لڑکوں کو تو ذبح کر ڈالتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔بے شک وہ تھا ہی مفسدوں میں سے۔سورہ القصص آیت ۵۔مترجم)۔ جو بھی معاشرہ مختلف

Marfat.com

گروہوں میں بٹا ہوا ہو، آخر کار تباہی اور بربادی سے دوچار ہوگا کیونکہ ایسا معاشرہ قوانین فطرت کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہ ایک مہیب اور ہولناک زمانہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اہل فارس اور بازنطینیوں کے درمیان جنگوں کا لامتناہی سلسلہ پرانے عالمی نظام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، خود عرب کے اندر قبائلی لڑائیوں نے بھیانک شکل اختیار کر لی تھی۔ پچھلے بیس برسوں کے دوران غزوے نے، جو دشمن کے خلاف مختصر لیکن تباہ کن کارروائی ہوتی، شدید قحط اور خشک سالی کے ساتھ مل کر عسکری مہموں کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس وقت ذہنوں میں یہ الہامی احساس پیدا ہو گیا تھا کہ شہر پر تباہی آنے والی ہے۔ رسول کریمؐ کو یقین تھا کہ جب تک قریش اپنے رویے اور طرز عمل میں اصلاح نہیں کرتے۔ وہ بھی عنقریب پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والی لاقانونیت کا شکار ہو جائیں گے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے عطا کیے ہوئے روحانی وجدان کی بدولت ایک نئے حل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حضورؐ کو پختہ یقین تھا کہ آپؐ اپنی جانب سے کوئی بات نہیں کر رہے بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے بھیجے ہوئے الفاظ دہرا رہے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ اور مشکل عمل تھا۔ آں حضرتؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''مجھ پر ایک دفعہ بھی وحی کی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی کہ میں نے یہ خیال نہ کیا ہو کہ میری روح کو بے دردی کے ساتھ مجھ سے جدا کیا جا رہا ہے۔''

(جلال الدین سیوطی: الاتقان فی علوم القرآن:Maxime Rodinson: Muhammad,p.74)۔

بعض اوقات خدا کا پیغام پوری طرح واضح ہوتا اور آپؐ جبریل امینؑ کو دیکھ اور سن سکتے تھے۔ قرآن کریم کے الفاظ حیات بخش ابر کی بوچھاڑ کی طرح حضورؐ پر گرتے۔ لیکن دبی ہوئی یہ ربانی آواز اکثر اوقات مبہم ہوتی: ''کئی مرتبہ زبانی مضمون پوری طرح واضح ہوتا اور میں فرشتے (جبریلؑ) کو انسان کی صورت میں دیکھتا اور اس کے الفاظ سنتا لیکن بعض اوقات یہ ایک تکلیف دہ اور ناقابل فہم الہام ہوتا۔ بعض اوقات یہ ایک گھنٹی کی گونج کی طرح سنائی دیتا ہے جو میرے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن جب میں اس پیغام سے آگاہ ہو جاتا ہوں تو گھنٹیوں کی یہ گونج مدھم پڑ جاتی ہے۔'' (بخاری حدیث ۱ تا ۳:Lings: Muhammad: pp.44,45)۔ آپؐ کو واقعات کی حقیقی تہ تک پہنچنے کے لیے زیر زمین شورش کو سننا پڑتا اور اس جدوجہد میں آپؐ کا رنگ زرد ہو جاتا۔ ربانی تجلیات سے پناہ لینے کے لیے حضورؐ لبادہ اوڑھ لیتے۔ جب آپؐ عربوں کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی غرض سے ربانی مشاہدے کی کیفیت سے دوچار ہوتے تو شدید سردی میں بھی آپؐ کو پسینہ آ جاتا اور آپؐ کی حالت اس شاعر جیسی ہو جاتی جو فکر کی گہرائیوں میں اتر کر اظہارِ خیال کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت کی کہ آپؐ وحی کے الفاظ کو نہایت توجہ سے سن کر ان پر غور کریں اور جب تک ان کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو جائے، ان سے قبل از وقت کوئی

Marfat.com

نتیجہ اخذ نہ کریں۔ (تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے، ہاں یہ دعا کر پروردگار، میرا علم بڑھا۔ سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴۔ مترجم۔ (اے نبیؐ) آپؐ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور (آپؐ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپؐ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ سورہ القیٰمہ آیات ۱۶ تا ۱۸۔ مترجم)۔

جس طرح خدا عبرانی پیغمبروں کے ذریعے یہودیوں کے صحیفوں میں ان سے مخاطب ہوا، اسی طرح وہ قرآن کریم میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنا ترجمان بنا کر مکہ کے لوگوں سے ہم کلام ہوا۔ چنانچہ قرآن پاک کی زبان مقدس ہے کیونکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ اس میں خود خدا کی طرف سے بولے گئے الفاظ من وعن درج ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے پیروکار جب پہلے پہل حضورؐ کی زبان مبارک سے اور بعد میں ماہر قاریوں سے قرآن کے الفاظ سنتے تو وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچانک ملاقات ہوگئی ہے۔ اسی طرح توریت کی وجہ سے عبرانی کو مقدس زبان سمجھا جاتا ہے لیکن عیسائیوں کے ہاں مقدس زبان کا کوئی نظریہ موجود نہیں کیونکہ عہد نامہ جدید یونانی زبان میں لکھا گیا ہے۔ عیسائیوں کے صحیفوں میں حضرت عیسیٰؑ نے اللہ کی زبان میں انسانیت سے خطاب کیا ہے۔ دوسرے تمام الہامی صحیفوں کی طرح قرآن حکیم میں بھی انسانوں کو ذات مطلق کے ساتھ مکالمے کا موقع فراہم کر کے ہماری کمزور، ناپائیدار اور فانی دنیا اور رب کائنات کے درمیان پائی جانے والی وسیع خلیج کو پر کیا گیا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرامؓ ہر نئی سورت کے نزول کا نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کرتے اور جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی تو وہ اسے حفظ کر لیتے اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، وہ اسے لکھ لیتے۔ وہ قرآن پاک کی فصیح و بلیغ زبان سے بے حد متاثر ہوتے اور انہیں یقین تھا کہ ایسی زبان میں قرآن صرف خدا کی طرف سے نازل ہوسکتا ہے۔ کسی غیر عرب شخص کی جانب سے قرآن پاک کے حسن اور رعنائی کی تحسین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ اس کے متن میں اکتا دینے والی تکرار موجود ہے، اس کا کوئی مخصوص اسلوب نہیں، نہ ہی اس میں تواتر کے ساتھ دلائل پیش کیے گئے ہیں اور نہ ہی منظم انداز میں واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید ترتیب وار نازل نہیں ہوا، جب اسے قطعی شکل دی گئی تو لمبی سورتوں کو شروع میں اور مختصر ترین سورت کو آخر میں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کی ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ہر سورت میں لازمی تعلیمات بیان کی گئی ہیں لہٰذا اس کا قاری کسی بھی مرحلے پر اس کے متن میں غوطہ زن ہو کر اہم اسباق کو اخذ کر سکتا ہے۔

رسول کریمؐ عمومی اصطلاح کے مطابق لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ لفظ قرآن کا مطلب ہے پڑھنا۔ یہ

Marfat.com

کتاب نجی مطالعے لیے نہیں بلکہ دوسرے الہامی صحیفوں کی طرح اسے بھی بلند آواز سے پڑھنا چاہیے۔ عرب میں شاعری کو زبردست اہمیت حاصل تھی اور شاعر کو اپنے قبیلے کے ترجمان، سماجی تاریخ دان اور ثقافتی اتھارٹی تسلیم کیا جاتا تھا۔ عربوں نے سیکڑوں برسوں سے کسی کے کلام کو سننے کا چلن سیکھ رکھا تھا۔ ان کے کان نغمہ و آہنگ سے آشنا تھے۔ (Michael Sells: Approaching the Quran) ۔ شاعر حضرات سالانہ تجارتی میلوں میں پورے جزیرہ نما سے جمع ہونے والے سامعین کو غنائیہ نظمیں اور قصیدے سنا کر انہیں جوش دلاتے۔ مکہ سے باہر عکاظ کے میلے میں ہر سال شاعری کا اہم مقابلہ ہوتا اور مقابلے میں اول آنے والی نظموں کو عمدہ سیاہ کپڑے پر سونے کے تاروں سے لکھ کر انہیں کعبے کی دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا۔ چنانچہ حضورؐ کے پیروکار قرآنی متن کے ان ربانی اشاروں کو خوب سمجھتے تھے جن کا حسن ترجمے میں ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ موسیقی کے زیر و بم کی طرح قرآن پاک کے موضوع، الفاظ، محاوروں، ترکیبوں اور صوتی اتار چڑھاؤ کی بدولت اس کی حقیقی نغمگی میں لطیف اضافہ ہو جاتا ہے اور تہ بہ تہ اسرار کے پردے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں مختلف نظریات، تشبیہوں، استعاروں اور قصے کہانیوں کی دیدہ دانستہ طور پر تکرار کی گئی ہے جس کا مقصد قاری کو داخلی صدائے بازگشت سے ہم آہنگ کرنا اور قرآن پاک کی مرکزی تعلیمات کو اس کے دل پر نقش کرنا ہے۔ اسلام کے ابتدائی پیروکار قرآن کریم کے ان پیروں کا آپس میں ربط پیدا کرتے جو شروع میں بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے تھے، وہ متن کے مختلف دھاگوں کو باہم مربوط کرتے اور ان کے درمیان پائے جانے والے اس لطیف تعلق کو اجاگر کرتے جس کے ذریعے ایک آیت دوسری آیت کی تکمیل اور توثیق کرتی ہے۔ قرآن مجید کوئی ایسی واقعاتی معلومات مہیا نہیں کر رہا تھا جو ایک لمحے میں قاری کو منتقل کر دی جاتیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح دوسرے سامعین کو بھی قرآنی تعلیمات آہستہ آہستہ جذب کرنا پڑتیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تفہیم میں پختگی پیدا ہو جاتی اور قرآن کریم کی دل فریب اور رمز و کنایہ کی زبان اور ترنم انہیں اپنے ذہنی عمل کی رفتار کو کم کرنے اور شعور کی نئی جہت میں داخل ہونے میں معاون ثابت ہوتا۔

امریکا کے اسکالر میخائیل سیلز Michael Sells نے مصر میں گرمیوں کے موسم میں مسافروں سے بھری ایک بس میں ڈرائیور کی طرف سے قرآن پاک کی تلاوت کا کیسٹ چلانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''تلاوت شروع ہوتے ہی استغراق کی وجہ سے مسافروں پر خاموشی چھا گئی۔ لوگوں میں تناؤ کی کیفیت ختم ہوگئی، جگہ حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کا خاتمہ ہوگیا، جو مسافر باتیں کر رہے تھے، وہ خاموش جب کہ باقی مسافر خیالوں میں گم سم ہو گئے۔ غرض سکون نے اضطراب پر غلبہ حاصل کر لیا۔''

دم کشی پر کنٹرول کو استغراق طاری کرنے والی (Sells: Approaching the Quran, pp.183-84)۔

Marfat.com

بیشتر روایات میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ روح کو آواگون سے نجات دلانے کا طریقہ ریاضت اختیار کرنے والے یوگیوں کا خیال ہے کہ اس سے ان میں وسعت پذیری کی صلاحیت کو مہمیز ملتی ہے جس کا موسیقی سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ (Yoga: Immorality and Freedom, p.56)۔ قرآن مجید کے قارئین باہر کی طرف سے سانس لے کر مدھم آواز میں طویل آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور جب وہ اندر کو سانس لیتے ہیں تو وہ جذب واستغراق کی کیفیت طاری کرنے کے لیے خاموش توقف کرتے ہیں۔ اس سے سامعین کو بھی دم کشی میں توازن پیدا کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور ان میں سکون حاصل کرنے اور مرض سے شفایاب ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے قرآنی تعلیمات پر گرفت مضبوط کرنے میں مدد ملتی ہے۔

خدا کسی بلند و بالا مقام سے ہدایات جاری نہیں کر رہا تھا۔ ربانی آواز پورے تسلسل کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی اور ''ہم''، ''وہ''، ''تمہارا پروردگار''، ''اللہ'' یا ''میں'' کے الفاظ سے رسول کریمؐ اور آپؐ کے سامعین کے درمیان گہرا تعلق پیدا ہو جاتا۔ خدا کسی مرد کی حیثیت سے بھی ممیز نہیں تھا۔ قرآن کی ہر سورت کا آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ (ماسوائے سورہ توبہ کے جس کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درج نہیں ہے۔ مترجم)۔ اللہ کے نام کا تعلق جنس مذکر سے ہے لیکن دوسرے خدائی نام الرحمٰن اور الرحیم از روئے قواعد زبان نہ صرف نسوانی ہیں بلکہ علم اللسان کی رو سے ان کا تعلق رحم کے لفظ سے ہے۔ اس کا اظہار تقریباً تمام ابتدائی سورتوں میں ایک مجازی نسوانی شخصیت کے طور پر ہوتا ہے اور ہم اشارے کنائے میں ایک خاتون کو حالت حمل یا بچہ پیدا کرنے کی مستور کیفیت میں دیکھتے ہیں۔ ہمیں ایک ایسی خاتون کا عکس نظر آتا ہے جس کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا ہے یا ایک ایسی نومولود بچی کا مشاہدہ کرتے ہیں جسے اس کے مایوس والدین نے قتل کر دیا ہے۔ (Sells: Approaching the Quran, pp.183-204)۔ اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی۔ سورہ التکویر آیات ۸، ۹۔ مترجم)۔ مکہ کے جارحانہ سرداری نظام میں نسوانی موجودگی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کے پیغام پر سب سے پہلے خواتین نے لبیک کہی۔

قرآن مجید کی ہر سورت میں خدا نہایت بے تکلفی کے ساتھ انسان سے مخاطب ہوا اور اپنی تعلیمات کو سوال کی شکل میں ظاہر کیا: ''کیا تم نے نہیں سنا؟''، ''کیا تم غور نہیں کرتے؟''، ''کیا تم نے نہیں دیکھا؟'' چنانچہ خدا نے ہر سننے والے مرد اور عورت کو یہ دعوت دی کہ وہ خود حقائق کی جانچ پڑتال کرے۔ صرف ونحو کے مطابق عام طور پر ہر سوال کا جواب مبہم یا غیر واضح ہوتا۔ اس طرح کوئی فیصلہ کن جواب دینے کے بجائے خدا نے ان نکتوں کی طرف اشارہ کر دیا جن پر انسان کو اپنے وجدان کی مدد سے غور وخوض کرنا چاہیے۔ (تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ بدلے کا

Marfat.com

دن کیا ہے؟ میں پھر (کہتا ہوں کہ) تجھے کیا معلوم کہ جزا (اور سزا) کا دن کیا ہے؟ سورہ الانفطار آیات ۱۷، ۱۸۔ مترجم)۔ تجھے کیا معلوم سجین کیا ہے؟ (یہ تو) لکھی ہوئی کتاب ہے۔ تجھے کیا پتا کہ علیین کیا ہے؟ (وہ تو) لکھی ہوئی کتاب ہے۔ سورہ المطففین آیات ۸، ۹، ۱۹، ۲۰۔ مترجم)۔ خدا کا یہ نیا دین مابعد الطبیعیاتی ایقان حاصل کرنے کا متقاضی نہیں تھا بلکہ قرآن کا مطمح نظر انسانوں میں ایک مختلف نوع کا شعور و آگہی پیدا کرنا تھا۔

قرآن مجید کے ابتدائی پیغام میں قیامت کے متعلق مسیحی تصور کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ رسول کریمؐ کو یقین تھا کہ مکہ میں بحران کی وجہ یہ ہے کہ قریش خود کو اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں سمجھتے۔ لق و دق میدانوں میں ممکن تھا کہ ایک کریم شخص متکبر اور خود پسند ہو لیکن اسے بہ ہر حال یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کا ذمے دار ہے۔ لیکن قریش تو زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی ہوس میں مبتلا تھے اور ''کمزوروں'' کی حالت پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ وہ یہ محسوس نہیں کر رہے تھے کہ ان کے کاموں کے دیرپا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لاپروائی اور غفلت کا سدباب کرنے کے لیے قرآن نے یہ تعلیم دی کہ افراد کو خدا کے سامنے اپنے طرزِ عمل کا جواب دینا پڑے گا۔ پھر ایک دن قیامت (یوم الدین) آ جائے گی۔ عربی کی یہ اصطلاح ''صداقت'' کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔ (Sell: Approaching the Quran)۔ دنیاوی زندگی کے خاتمے پر تمام انسانوں کو ان تکلیف دہ حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے گریز کرنے کی وہ کوشش کرتے رہے تھے۔ پھر ایک اور زندگی ملے گی جس میں وہ ہر چیز فنا ہو جائے گی جسے ہم ٹھوس، اہم اور مستقل سمجھتے رہے ہوں گے۔ قرآن پاک کی ابتدائی سورتوں میں اس سراب کا پردہ یوں چاک کیا گیا ہے:

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا
اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے
اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے
اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں
اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے
اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے
تو اس دن ہر شخص جان لے گا جو کچھ لے کر آیا ہوگا (سورہ التکویر آیات ۱ تا ۶، ۱۴)

قیامت کے دن سورج، چاند اور ستارے غائب ہو جائیں گے بلکہ صحرائے عرب کی سب سے قیمتی متاع حاملہ اونٹنی کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ اس دن اصل اہمیت انسان کے اعمال کی ہوگی:

اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر لوٹیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھا دیے جائیں

Marfat.com

پس جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا
اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا (سورہ الزلزال آیات ۶ تا ۸)

اس وقت جو کام غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں، قیامت کے دن وہ اعمال نہایت بھاری اور اہم ثابت ہوں گے اور خود غرضی اور بے رحمی کا کوئی فعل یا فیاضی کا معمولی کام انسانی زندگی کا پیمانہ ہوگا۔ ''کسی گردن (غلام یا لونڈی) کا آزاد کرنا یا بھوک والے دن کھانا کھلانا کسی رشتے دار یتیم کو یا خاکسار مسکین کو۔'' (سورہ البلد، آیات ۱۳ تا ۱۶۔ مترجم)۔

جس کسی نے یہ نیک کام (صالحات) کیے ہوں گے، اسے جنت (علیین) میں دائمی انعام دیے جائیں گے لیکن جن لوگوں نے مادی املاک اکٹھی کرنے پر توجہ مرکوز رکھی، انہیں جحیم میں سزا دی جائے گی۔ جحیم ایک نامانوس لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''بھڑکتی ہوئی ہولناک آگ''۔ لیکن قرآن حکیم نے جہنم کا الہامی وژن پیش نہیں کیا۔ جن قرآنی آیات میں جحیم کا تذکرہ ہوا ہے، ان میں غصے کے بجائے دل گیری اور آزردگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی بعد کی روایات میں جنت، دوزخ اور روز قیامت کے موضوعات کی تصریح کی گئی ہے لیکن قرآن مجید میں کم سخنی اور سکوت سے کام لیا گیا ہے، قرآن کی زبان پراسرار اور عقل وفہم کو گرداب میں ڈالنے والی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم سننے والوں کو فوری طور پر فیصلہ سننے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قیامت کا دن محض کوئی دور افتادہ واقعہ نہیں، یہ راستی اور ''صداقت کا لمحہ'' ہے۔ کسی معاملے کی تہ تک پہنچنے، بے تکلفانہ سوال پوچھنے اور زمانہ حال کے صیغے استعمال کرنے سے سامعین کو روزمرہ بنیاد پر اپنے طرز عمل کے نتائج کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ انسان یہ جان کر پشیمان ہوتا ہے کہ اس نے زمین پر اپنا وقت ضائع کر دیا ہے اور اب اس قدر تاخیر ہو چکی ہے کہ اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم انسانوں سے بار بار یہ سوال پوچھتا ہے: ''تم زندگی کو کس جانب لیے جا رہے ہو؟'' (پھر تم کہاں جا رہے ہو؟ سورہ التکویر آیت ۲۶۔ مترجم)۔ انسان پیدائشی طور پر برا نہیں لیکن وہ لاپروائی اور غفلت کا شکار ہے، وہ چاہتا ہے کہ پریشان کن خیالات کو ذہن کے عقبی خانے میں دھکیل کر انہیں فراموش کر دے۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں یقین دہانی (ذکر) کرانے کا عمل مسلسل جاری رکھا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرماتا ہے: ''پس آپؐ نصیحت کر دیا کریں (کیونکہ) آپؐ صرف نصیحت کرنے والے ہیں، آپؐ ان پر کچھ داروغہ نہیں ہیں۔'' (سورہ الغاشیہ آیات ۲۱، ۲۲۔ مترجم)۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں کو اس بارے میں پوری طرح آگاہ رہنا چاہیے کہ وہ کیا کام کر رہے ہیں؟ انہیں اپنی زندگیوں کو تقوے کے اوصاف سے سنوارنا چاہیے۔ تقوے کے لفظ کا بعض اوقات ''خوف'' ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا بہتر ترجمہ ہے ''شعور وآگہی''۔ انہیں خود غرضی، لالچ اور تکبر سے مسلسل اجتناب کرنا چاہیے۔ انسانوں

Marfat.com

پر لازم ہے کہ وہ دوزخ کے عذاب سے خوف زدہ ہونے کے بجائے فطری دنیا میں خالق کائنات کی فیاضی اور اس کے لطف وکرم پر مبنی نشانیوں (آیات) پر غور وفکر کریں:

کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے ہیں
اور آسمانوں کو کہ کس طرح اونچا کیا گیا ہے
اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح گاڑ دیے گئے ہیں
اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے (سورہ الغاشیہ آیات ۱۷ تا ۲۰۔ مترجم)

پوری کائنات ایک پردہ تھی جس نے خالق کی موجودگی کو چھپا رکھا تھا۔ دن کے بعد رات، سورج اور چاند، حیات بخش بارش اور انسانوں کی تخلیق اور حیرت انگیز ساخت، غرض یہ تمام چیزیں خدا کی موجودگی کی نشانیاں ہیں جن پر ایک منظم انداز میں استقلال کے ساتھ غور وفکر کرنے سے انسان کو پس پردہ حقائق کا ادراک ہوتا ہے اور وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔

اس زمانے میں قریش ''کمزوروں'' کو حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ناکامی اور غربت پیدائشی طور پر ورثے میں ملتی ہے اور شرفا میں یہ چیزیں موجود نہیں ہونی چاہییں۔ چنانچہ وہ غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے سلسلے میں کوئی ذمے داری محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ وہ زندگی کے ہر لمحے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو وہ اپنی کمزوری کی تحسین کرتے اور ان کا غرور اور تکبر حیرت اور خوف میں تبدیل ہو جاتا۔ وہ استغنیٰ اور تونگری سے دست بردار ہو جاتے اور کسی مخلوق کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے تائب ہو جاتے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خواہش تھی کہ مکہ کا ہر مرد، عورت اور بچہ عجز وانکسار کی اس خصوصیت سے مالا مال ہو جائے جو انسان کا طرہ امتیاز ہے۔

رسول کریمؐ کو محض سماجی اصلاح کے لیے کام کرنے سے آسودگی حاصل نہیں ہوتی تھی بلکہ آپؐ کو پختہ یقین تھا کہ جب تک دل تبدیل نہیں ہوتے، خالص سیاسی پروگرام صرف سطحی اور مصنوعی ہوگا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کی مختصر جماعت کو وہ ارکان عبادت سکھا دیے جن کی بدولت ان کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔ اسلام قبول کرنے والے یہ لوگ سب سے پہلے نماز (صلوٰۃ) کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے جس سے انہیں روزانہ ان کے فرائض کی یاددہانی کرائی جاتی۔ نماز سے ان کے روزمرہ کے کاروباری معمولات رک جاتے اور انہیں یہ باور ہو جاتا کہ ان کی اولیں ترجیح اللہ ہے۔ ''مروہ'' کے کلچر میں پروان چڑھنے والے مردوں اور عورتوں کے لیے سجدے کی غرض سے غلاموں کی طرح زمین پر لیٹنا بہت مشکل تھا چنانچہ اس ذلت آمیز ہیئت پر بہت سے قریش کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ لیکن نماز میں جسمانی اشارت انسان کی طرف سے پورے جسم کو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم

Marfat.com

کرنے اور خدا کی کامل اطاعت کی علامت ہے۔اس سے عمیق سطح پر مسلمانوں کے جسموں کو بھی یہ سبق ملتا ہے کہ وہ خودنمائی اور تکبر کی روش کو ترک کر کے اپنی زندگیوں کو اعلیٰ اوصاف سے سنواریں۔ چنانچہ وہ مرد اور عورت، جو خدا کے سامنے سر جھکانے کو اپنا شعار بنائے اور خدا کا غلام ہونے پر فخر کرے، مسلمان ہے۔

ملت اسلامیہ (امہ) کے لیے جو دوسری بات لازم قرار دی گئی وہ زکوٰۃ تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مسلمان اپنی آمدنی کا ایک حصہ غریبوں کے لیے وقف کر دے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی بدولت خود بینی و خودنمائی کے عنصر کو روایتی بدوی فیاضی سے نکال دیا گیا اور اب تمام مسلمان عاقبت نااندیشانہ اسراف اور فیاضی کا بے جا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنی آمدنی کا ایک حصہ باقاعدگی کے ساتھ قبیلے کے کمزور لوگوں کو دینے لگے۔ نیا کریم شخص اب وہ آدمی نہیں تھا جو اپنی پوری دولت کو ایک ہی رات میں لٹا دے بلکہ یہ وہ شخص تھا جو ''انصاف کے کاموں'' کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا تھا۔ اس مرحلے پر نئے دین کو تزکی' (میل کچیل سے دور کرنا) کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ (Watt: Muhammad at Mecca, p.68)۔غریبوں اور بے کسوں کی دیکھ بھال کرنے، غلاموں کو آزاد کرنے اور ہر گھڑی ہر دن معمولی کاموں سے رحم دلی کے جذبات کا اظہار کرنے سے مسلمانوں میں لطف و کرم کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہو گئے اور ان میں ایک محتاط اور ذمے دار روح بتدریج اجاگر ہونے لگی جس میں خود اللہ تعالیٰ کی سخاوت اور بے پایاں عنایات کا عکس نظر آتا تھا۔ اس طرز عمل کی بدولت تکبر اور خودنمائی ان کے دلوں سے محو ہو گئی اور وہ روحانی بالیدگی کے ارفع مقام پر فائز ہو گئے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تین برس تک خاموشی اور احتیاط کے ساتھ منتخب لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے لیکن آپؐ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۶۱۵ عیسوی میں اللہ نے حضورؐ کو اپنے قبیلے بنی ہاشم کو اسلام کی دعوت دینے کی ہدایت کر دی۔ (اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرا دے۔ سورہ الشعرا آیت ۲۱۴۔ مترجم)۔ ''یہ کام میری طاقت سے باہر ہے!'' آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ اس کے باوجود آپؐ نے اپنا مشن جاری رکھا اور قبیلے کے چالیس سرکردہ افراد کو کھانے کی دعوت دے دی۔ یہ سادہ دعوت خود ایک پیغام تھی۔ رسول اللہؐ کو خودنمائی کی غرض سے کی جانے والی پرتعیش مہمان نوازی پسند نہیں تھی جو عربوں میں طاقت اور اعتماد کی نمائش کے لیے ایک روایت بن گئی تھی۔ (اور رشتے داروں کا اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو۔ بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیات ۲۶، ۲۷۔ مترجم)۔ حضورؐ یہ محسوس کرتے تھے کہ فضول خرچی اور نمائش کا یہ طریق کار پرانے غرور اور تکبر کا آئینہ دار ہے، عیش پسندی اور لذیذ مرغوبات نہ صرف دولت کا ضیاع بلکہ اللہ تعالیٰ کے قیمتی عطیے کی ناقدری اور ناشکری ہے۔ حضرت علیؓ نے جب صرف گوشت اور دودھ ان معتبرین کے

Marfat.com

سامنے پیش کیا تو انہیں یہ کھانا دیکھ کر حیرت اور تعجب ہوا۔ بعد میں اس دعوت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ روٹیوں اور دو مچھلیوں کے معجزے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ دعوت میں اگرچہ صرف ایک آدمی کے لیے کھانا موجود تھا، اس کے باوجود ہر شخص کے لیے ضرورت سے زیادہ کھانا دستیاب تھا۔ دعوت کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن کریم کے بتلائے ہوئے بعض اصولوں کی وضاحت کی۔ لیکن اس دوران ابوطالب کے سوتیلے بھائی ابولہب نے نہایت گستاخانہ انداز میں رسول کریمؐ کے سلسلہ کلام میں مداخلت کی اور چیختے ہوئے کہنے لگا: ''اس شخص نے تم پر جادو کر دیا ہے۔'' چنانچہ دعوت کے شرکا منتشر ہو گئے۔ اگلے روز حضورؐ کو دوبارہ ان لوگوں کو مدعو کرنا پڑا۔ اس دعوت میں آپؐ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی پھر وضاحت کی اور فرمایا:

''اے عبدالمطلب کے بیٹو! میں ایسے کسی عرب کو نہیں جانتا جس نے اپنی قوم کے سامنے مجھ سے بہتر اور افضل پیغام پیش کیا ہو۔ میں تمہارے لیے اس دنیا اور آخرت کے لیے بہترین چیز لایا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچاؤں۔ سو تم میں سے جو شخص اس مشکل کام میں میرے ساتھ تعاون کرے گا، وہ میرا بھائی، میرے احکام کی تعمیل کرنے والا اور میرا قائم مقام جانشین ہوگا۔''

اس پر مجمع میں گہری خاموشی چھا گئی اور شرکائے دعوت ہراساں ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سب حضورؐ کو بچپن سے جانتے تھے جن کی گزر بسر اپنے رشتے داروں کی امداد پر تھی۔ آخر انہوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرنے کی کیونکر جرأت کی ہے؟ رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی جعفر اور آپؐ کے متبنیٰ زید تک اس سکوت کو توڑنے کی ہمت نہ کر سکے لیکن ۱۳ سالہ علیؓ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی کم سنی کے باوجود اس طرح مخاطب ہوئے:

''اے اللہ کے رسولؐ! میں اس معاملے میں آپؐ کی اعانت کروں گا۔'' یہ سن کر آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''یہ میرا بھائی، میرے احکام کی تعمیل کرنے والا اور تم لوگوں میں میرا جانشین ہے۔ اس کی بات توجہ سے سنو اور اس پر عمل کرو۔'' حاضرین کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ سب لوگ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب قہقہے لگاتے ہوئے ابوطالب سے کہہ رہے تھے: ''اس نے تمہیں اپنے بیٹے کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔''

(ابوجریر الطبری: تاریخ الرسول والملوک صفحہ ۱۱۷-۱۱۸: The Life of Muhammad, pp.117-118)۔

اس مایوس کن صورت حال کے باوجود رسول کریمؐ نے ہمت نہ ہاری اور پوری قوت کے ساتھ شہر میں تبلیغ کا کام جاری رکھا البتہ اس کام میں آپؐ کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن کسی شخص نے حضورؐ کے سماجی پیغام پر

Marfat.com

کوئی نکتہ چینی نہ کی۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ ''مروہ'' کے اصولوں کے مطابق قبیلے کے غریب لوگ بھی ان کی دولت کے حصے دار ہیں اور موجودہ صورت حال ان کے لالچ اور دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ بیشتر لوگوں نے روز قیامت پر اعتراض کرتے ہوئے اسے محض قصے کہانیوں سے تعبیر کیا۔ وہ جسم کس طرح دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں جن کی ہڈیاں زمین میں گل سڑ چکی ہیں؟ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ان کے قابل احترام آباء واجداد قبروں سے اٹھ کر مالک کائنات کے حضور کھڑے کیے جائیں گے؟ (کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا خیال نہیں۔ سورہ المطففین آیت ۴۔ مترجم)۔ بلکہ تو تعجب کر رہا ہے اور یہ مسخرا پن کر رہے ہیں۔ اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے، یہ نہیں مانتے۔ اور جب کسی معجزے کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل کھلم کھلا جادو ہی ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈی ہو جائیں گے پھر کیا (سچ مچ) اٹھائے جائیں گے۔ کیا ہم سے پہلے کے باپ دادا بھی؟ آپؐ جواب دیجیے کہ ہاں ہاں اور تم ذلیل (بھی) ہوؤ گے۔ وہ تو صرف ایک زور کی جھڑکی ہے کہ یکا یک یہ دیکھنے لگیں گے۔ سورہ الصفت، آیات ۱۲ تا ۱۹۔ مترجم)۔ قرآن کریم جواب دیتا ہے کہ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں اور یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک ادنیٰ غلیظ قطرے سے انسان کو تخلیق کر سکتا ہے تو وہ ایک مردہ جسم کو بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ (کیا اب بھی تم نصیحت نہیں پکڑتے؟)۔ انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مار ڈالتا ہے (دراصل) انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں۔ یہ تو صرف (قیاس اور) اٹکل سے ہی کام لے رہے ہیں۔ سورہ الجاثیہ آیت ۲۴۔ مترجم)۔ کیا انسان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکا یک وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا۔ اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپؐ جواب دیجیے کہ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔ وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی جس سے تم یکا یک آگ سلگاتے ہو۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (بینا) ہے۔ وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ سورہ یٰسین آیات ۷۷ تا ۸۳۔ مترجم)۔ قرآن مجید میں یہ عندیہ بھی دیا گیا ہے کہ جو لوگ روز قیامت کے نظریے کا مذاق اڑاتے ہیں، اصل میں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے خود غرضانہ اور ظالمانہ طرز عمل کو تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ''اس دن جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہے۔ جو جزا اور سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے۔ اسے صرف وہی جھٹلاتا ہے جو حد

Marfat.com

سے آگے نکل جانے والا (اور) گناہ گار ہوتا ہے۔'' (سورہ المطففین، آیات ۸تا۱۲۔مترجم)۔ جب قرآن میں انسانی زندگی کے انجام کے بارے میں بار بار استفسار کیا گیا تو انہوں نے اس سے انکار اور اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ لیکن اپنے انکار اور تشکیک کے باوجود بیشتر قریش کا خیال تھا کہ حضورؐ کو تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ تجارت پیشہ لوگ تھے اور انہیں نظریاتی بحث مباحثوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں پتا تھا کہ کسی بھی سنگین داخلی تنازعے کا ان کی تجارت پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ بہ ہر حال غلاموں، ناراض نوجوانوں اور ناکام تاجروں کے اس مختصر گروہ سے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا اور بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی تحریک جلد دم توڑ دے گی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کے ساتھ کھلی محاذ آرائی سے گریزاں تھے۔ آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ مکہ کو، جو ام القریٰ ہے، کوئی نقصان پہنچے۔ آپؐ کو علم تھا کہ بعض قریش کا یہ خیال ہے کہ آپؐ بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ عربوں میں بادشاہت کے بارے میں گہرے شکوک وشبہات پائے جاتے تھے اور ان کے لیے یہ ایک قابل نفرت نظریہ تھا۔ لیکن حضورؐ کے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے۔ خدا نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ اپنے نکتہ چینوں کو دوبارہ یہ یقین دلائیں کہ آپؐ کسی سرکاری منصب کے آرزومند نہیں۔ آپؐ صرف ڈرانے والے (نذیر) اور انسانوں کو شعور وآگہی بخشنے والے پیغمبر ہیں، آپؐ عجز وانکسار کے ساتھ قریش سے رابطہ کریں، ہر قسم کی اشتعال انگیزی سے گریز کریں، ان کے دیوتاؤں پر حملہ نہ کریں اور اس ضمن میں محتاط طرز عمل اختیار کریں۔ ماضی کے عظیم پیغمبر بھی اسی روش پر کاربند رہے ہیں۔ (اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ سورہ الانعام آیت ۱۰۸۔مترجم)۔ ایک پیغمبر کے لیے لازم ہے کہ وہ صاحب ایثار اور بے غرض ہو، اسے صرف اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ دوسروں کی عقل ودانش سے بھی استفادہ کرنا چاہیے اور برادری کی بہبود اس کی اولیں ترجیح ہونی چاہیے۔ نبی کو سب سے پہلے مسلمان ہونا چاہیے جو خدا کی کامل اطاعت کے لیے اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دے۔ (پھر بھی اگر تم اعراض ہی کیے جاؤ تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا۔ میرا معاوضہ تو صرف اللہ ہی کے ذمے ہے اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ سورہ یونس آیت ۷۲۔مترجم)۔ چنانچہ رسول کریمؐ نے کسی بھی سنگین تنازعے سے بچنے کے لیے اس مرحلے پر اپنے وحدانیت کے پیغام پر زور نہ دیا۔ حنیفیہ کی طرح آپؐ کو یقین تھا کہ اللہ ہی واحد معبود ہے لیکن آپؐ نے ابتدا میں کعبہ کے اردگرد رکھی گئی پتھر کی مورتیوں یا تین غرانیق کی مذمت نہ کی۔ دنیا کے دوسرے ادیان کے عارفوں اور حکیموں کی طرح آپؐ کو بھی انتہا پسندانہ نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

(Wilfred Cantwell Smith: Faith and Belief, pp.44-46: Ethico- Religious Concepts in Quran, pp.132-33)

Marfat.com

مابعد الطبیعیاتی قیاس آرائیاں لوگوں میں تنازعوں کو جنم دیتی ہیں جس کے نتیجے میں خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان مذہبی معاملوں پر بحث مباحثے کے بجائے، جن کی وجہ سے ان لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی جن کے دل جیتنے کے لیے آپؐ کوشاں تھے، انصاف کے اصولوں کا بول بالا کرنے پر توجہ مرکوز رکھی۔

لیکن مکہ میں کشیدگی میں بدستور اضافہ ہو رہا تھا۔ ۶۱۶ عیسوی میں بعض قریش نے مکہ کے باہر مسلمانوں کی ایک جماعت پر حملہ کر دیا جو مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز (صلوٰۃ) پڑھ رہی تھی۔ اس واقعے سے ہر شخص کو صدمہ پہنچا۔ مسلمانوں نے بھی جوابی کارروائی کی اور اسلام کے لیے خون کے پہلے قطرے اس وقت گرے جب سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک حملہ آور کو اونٹ کے جبڑے سے مار کر زخمی کر دیا۔ اس کے بعد ''شیطانی آیات'' کا رسوائے زمانہ واقعہ پیش آیا۔

Tor Andrae: Muhammad, the Man and His Faith, pp.22-35

W. Montgomery Watt: Muhammad's Mecca, pp.69-73

Watt: Muhammad at Mecca, pp.103-109

Bamyeh: Social Origins of Islam: pp.208-9

''شیطانی آیات'' کا قصہ رسول کریمؐ کے صرف دو سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے اور بعض اسکالروں کو یقین ہے کہ یہ کہانی وضعی اور غیر مستند ہے تاہم یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر یہ قصہ کیوں وضع کیا گیا ہے؟ حضورؐ کے دونوں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہؐ کی یہ خواہش تھی کہ قریش کے ساتھ آپؐ کی مصالحت ہو جائے۔ محمد ابن سعد نے اس کہانی کو اس طرح شروع کیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہتے تھے کہ قریش اور آپؐ کے درمیان کوئی ایسا شگاف پیدا نہ ہو کہ اس کا ازالہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ ایک دن آں حضرتؐ بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ آپؐ پر کوئی ایسی آیت نازل نہ ہو جس کے نتیجے میں قریش آپؐ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ (ابن سعد: کتاب الطبقات صفحہ ۱۳۷: Social Origins of Islam, p.208)۔ طبری نے اس قصے کو یوں بیان کیا ہے:

جب پیغمبر خداؐ نے یہ دیکھا کہ آپؐ کی قوم نے اپنی پشت پھیر لی ہے اور اس پیغام سے، جو آپؐ خدا کی طرف سے لائے ہیں، اجنبیت اختیار کر لی ہے تو آپؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ آپؐ پر خدا کی جانب سے کوئی ایسی وحی نازل ہو جس کے ذریعے قوم کے ساتھ آپؐ کی صلح ہو جائے۔ اپنے لوگوں کے ساتھ محبت اور ان کی حالت پر تشویش کے سبب یہ خیال آپؐ کے لیے خوش کن تھا کہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے جس نے آپؐ کے کام کو مشکل بنا دیا ہے۔ چنانچہ آپؐ اس منصوبے کے سلسلے میں

Marfat.com

مصالحت پر غور کرنے لگے جو آپؐ کو بہت عزیز تھا اور جس کی آپؐ کو تمنا اور خواہش تھی۔
(تاریخ رسول والملوک: صفحہ ۱۱۹۲: The Life of Muhammad, p.165)۔

طبری نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ایک دن جب آپؐ کعبہ میں غور و فکر کر رہے تھے تو اس سوال کا وحی کی صورت میں جواب آ گیا جس میں وحدانیت کے اصول پر سودے بازی کیے بغیر تین دیویوں کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب سورہ النجم نازل ہوئی تو اس وقت بہت سے قریش کعبۃ اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے نکتہ چینوں کو دوبارہ یہ یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ آپؐ راہ بھولے ہوئے نہیں ہیں، نہ ہی کوئی جن آپؐ کو القا کرتا ہے بلکہ آپؐ کو ذات خداوندی کا حقیقی مشاہدہ ہوا ہے اور آپؐ اپنے لوگوں کو وہ بات بتا رہے ہیں جو آپؐ نے دیکھی اور سنی ہے۔ (کیا تم جھگڑا کرتے ہو اس پر جو (پیغمبر) نے دیکھا۔ سورہ النجم آیت ۱۲۔ مترجم)۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے خدا کی بیٹیوں کے بارے میں آیات تلاوت کیں۔ ''کیا تم نے لات اور عزی کو دیکھا۔ اور منات تیسرے پچھلے کو۔'' (سورہ النجم آیات ۱۹، ۲۰۔ مترجم)۔ حضورؐ نے جب ان آیات کی تلاوت کی تو قریش اٹھ کر نہایت توجہ سے اس سورت کو سننے لگے۔ قریش کو ان دیویوں سے محبت تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ دیویاں اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں گی۔ آں حضرتؐ نے تلاوت جاری رکھتے ہوئے کہا: ''یہ اعلیٰ درجے کے پرندے (غرانیق) ہیں جن کی دعا قبول ہوتی ہے۔''

طبری نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ دو آیتیں شیطان (بہکانے والا) نے رسول کریمؐ کے منہ سے کہلوا دی تھیں۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ ایک خطرناک تصور ہے کیونکہ وہ شیطان کو راکشش اور برائی کی علامت سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس فرشتے کا تذکرہ موجود ہے جس نے خدا کی حکم عدولی کی تھی۔ اسے ابلیس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (لفظ ابلیس یونانی diabolos سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے چالاک، عیار)۔ لیکن جس شیطان نے تین دیویوں کی تعریف کرنے کی ترغیب دی، وہ کوئی خطرناک مخلوق نہیں تھا۔ شیطان محض جنوں کی ایک صنف ہے، اس کی حیثیت صرف بہکانے والے کی ہے جو انسانوں کو صحیح راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ دوسرے تمام جنوں کی طرح شیطان بھی ہر جگہ موجود اور فتنہ پرداز ہے لیکن اللہ کا مرتبہ خودسر اور ظالم و خونخوار مخلوق جیسا نہیں ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کے ساتھ امن کے خواہاں تھے۔ آپؐ جانتے تھے کہ قریش کو ان دیویوں کے ساتھ کس قدر عقیدت ہے۔ ممکن ہے آپؐ یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ اگر غرانیق کو نئے دین میں شامل کر لیا جائے تو اسلام کے بارے میں قریش کا رویہ نرم ہو جائے گا۔ جب آپؐ نے مبہم قرآنی آیات کی تلاوت کی تو وہ آپؐ کی خواہش کی آئینہ دار تھیں نہ کہ اللہ کی! دیویوں کی توثیق کرنا ایک غلطی تھی اور ممکن ہے کہ دوسرے عربوں کی طرح آپؐ نے بھی فطری طور پر اس غلطی کو شیطان سے منسوب کر دیا ہو۔

Marfat.com

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس جانب اشارہ نہیں کیا تھا کہ ''خدا کی بیٹیاں'' اللہ کی ہم مرتبہ ہیں۔ان کی حیثیت صرف مصالحت کرانے والوں کی سی تھی۔اسی آیت میں کہا گیا ہے کہ ان کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔(اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور چاہت سے جس کے لیے چاہے، اجازت دے دے۔سورہ النجم آیت ۲۶۔مترجم)۔ یہودی اور عیسائی اس قسم کے ثالثوں کو اپنی توحید پرستی کے موافق تصور کرتے ہیں۔نئی آیات حقیقی معنوں میں صورت حال سے مطابقت کی علامت تھیں اس لیے قریش پر ان کا فوری اثر ہوا۔حضورؐ نے جیسے ہی ان آیات کی تلاوت ختم کی، آپؐ سجدے میں گر گئے اور آپؐ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ قریش کے سردار بھی عجز وانکسار سے آپؐ کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی: ''محمد نے شاندار الفاظ میں ہمارے دیوتاؤں کی تحسین کی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ غرانیق ہیں جن کی سفارش قبول ہوتی ہے۔'' (طبری: تاریخ الرسول صفحہ ۱۱۹۲:The Life of Muhammad, p.166)۔اب بحران ختم ہو چکا تھا۔قریشی سرداروں نے حضورؐ کو بتایا: ''ہمیں معلوم ہے کہ اللہ ہی مارتا اور اللہ ہی زندگی دیتا ہے۔وہی پیدا کرتا ہے اور وہی حفاظت کرتا ہے۔لیکن ہماری یہ دیویاں اللہ کے پاس ہمارے لیے دعا کرتی ہیں۔اب چونکہ آپؐ نے انہیں خدائی اکرام میں حصے دار بنانے کی اجازت دے دی ہے، اس لیے ہم آپؐ کے ساتھ اتحاد کرنے کے خواہش مند ہیں۔'' (محمد ابن سعد: کتاب الطبقات صفحہ ۱۳۷:Andrae: Muhammad, p.22)۔

لیکن رسول کریمؐ اس صورت حال سے پریشان ہو گئے۔کیا قریش واقعی اپنا رویہ تبدیل کر کے غریبوں کو اپنی دولت کا حصے دار بنانے اور خدا کے عاجز ''غلام'' بننے کو تیار ہیں؟ لیکن بظاہر ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا۔آپؐ کو دیویوں کی تحسین کے ان لفظوں پر بھی تشویش ہوئی جو آپؐ نے کہے تھے۔قریش کے سردار خوشیاں منا رہے تھے کہ آں حضرتؐ گھر چلے گئے، آپؐ نے گوشہ تنہائی اختیار کر لی اور آپؐ پر استغراق کی کیفیت طاری ہو گئی۔اس رات جبریل امینؑ آپؐ کے پاس آ کر کہنے لگے: ''آپؐ نے یہ کیا کیا ہے؟ آپؐ نے ان لوگوں کے سامنے وہ کلام پڑھا ہے جو میں خدا کی طرف سے آپؐ کے لیے نہیں لایا تھا۔آپؐ نے وہ کچھ کہا ہے جو خدا نے آپؐ سے نہیں کہا تھا۔'' (طبری: تاریخ الرسول والملوک صفحہ ۱۱۹۲: The Life of Muhammad, p.166)۔ قریش کے ساتھ مصالحت کی خواہش نے خدائی پیغام کو مسخ کر دیا تھا۔اس پر آپؐ مغموم ہو گئے لیکن خدا نے متبادل آیات بھیج کر آپؐ کو تسلی دی۔تمام سابق پیغمبر اسی قسم کی ''شیطانی'' غلطیوں کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ وحی کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے سخت جدوجہد درکار ہے لیکن اگر مرسل اس وحی میں اپنے مصنوعی خیالات کو شامل کر لے تو اس سے ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن خدا نے اس آیت میں یہ کہہ کر وضاحت کر دی: ''ہم نے

Marfat.com

آپؐ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا، اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے دل میں کوئی آرزو کرنے لگا تو شیطان نے اس کی آرزو میں کچھ ملا دیا۔ پس شیطان کی ملاوٹ کو اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے پھر اپنی باتیں پکی کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دانا اور باحکمت ہے۔ (سورہ الحج آیت ۵۲۔ مترجم)۔ اس طرح ایک اہم اصول طے ہو گیا۔ جب کسی خاص پیغمبر پر وحی نازل ہو رہی ہو تو خدا اس کو تبدیل کر سکتا ہے۔ وحی کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے بعض اوقات پیغام خداوندی سے تازہ نتائج اخذ کر لیے جس سے آپؐ کی سابق بصیرت کی تصدیق ہو گئی۔

اب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو متبادل آیات لے کر قریش کے پاس جانا پڑا جن میں ''شیطانی'' آیات میں ترمیم کی گئی تھی۔ خدا نے ایک مرتبہ پھر یہ سوال کیا:

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا
اور منات تیسرے پچھلے کو (سورہ النجم آیات ۱۹، ۲۰)

لیکن اس مرتبہ اس کا جواب نہایت تند و تیز اور فیصلہ کن تھا۔ ''کیا تمہارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں ہیں۔ یہ تو اب بڑی ناانصافی کی تقسیم ہے۔ (سورہ النجم آیت ۲۱۔ مترجم)۔ یہ نام نہاد دیویاں صرف نام تھے جو قریش نے ان کے لیے رکھ لیے تھے، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ تو صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ (سورہ النجم آیت ۲۳۔ مترجم)۔ قریش کے منہ پر یہ ایک زوردار طمانچہ تھا جس سے نہ صرف غرانیق سے چھٹکارا مل گیا بلکہ قریش کے گمراہ آباء و اجداد کی بھی توہین کی گئی۔ قرآن کریم نے ان تین دیویوں کو فرشتوں کا درجہ کیوں نہ دیا؟ اس بظاہر بے ضرر نقطہ نظر کو قبول کر کے قریش کے ساتھ قیام امن کے امکانات کو کیوں مسترد کر دیا گیا؟

ظہور اسلام سے چار سال بعد بھی مسلمان روایتی مذہبی عبادت نہیں کر سکتے تھے۔ قریش کا عقیدہ تھا کہ اللہ ایک دور افتادہ دیوتا ہے جس کا ان کی روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیروکار اس عقیدے کو باطل سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم کے حسن اور رعنائی نے اللہ کو ایک فعال، متحرک اور بے پناہ حقیقت بنا دیا تھا۔ مسلمان جب قرآن کو سنتے ہیں تو ''ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب کا خوف کھاتے ہیں۔'' (سورہ الزمر آیت ۲۳۔ مترجم)۔ خدا کا کلام ایک ایسی طاقت ور حقیقت تھا جو پوری دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا تھا۔ چنانچہ خدا نے نبی کریمؐ کو بتایا: ''اگر ہم قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تو دیکھتا کہ وہ خوف الٰہی سے پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔'' (سورہ الحشر آیت ۲۱۔ مترجم)۔ اب اللہ کی ذات قریش

Marfat.com

کے معبودوں سے بالکل مختلف تھی اور ''شیطانی آیات'' میں دیا جانے والا یہ تاثر غلط تھا کہ اسلام پرانے مذہب جیسا ہے۔ یہ اندازِ فکر مضحکہ خیز تھا کہ پتھروں سے بنے غرانیق کے تین بت اسلام کے خدا پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے اب واضح خط امتیاز کھینچ دیا تھا۔ خدا کے سوا دوسرے تمام معبود حد درجہ کمزور قبائلی سرداروں کی طرح بے بس اور غیر موثر تھے۔ جس طرح اللہ اپنے بندوں کو رزق مہیا کرتا ہے، یہ بت اس طرح اپنے پجاریوں کو روزی فراہم نہیں کر سکتے، نہ ہی قیامت کے دن وہ ان کی سفارش کر سکیں گے۔ (تم تو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کی پوجا پاٹ کر رہے ہو اور جھوٹی باتیں دل سے گھڑ لیتے ہو۔ سنو! جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا پاٹ کر رہے ہو، وہ تو تمہاری روزی کے مالک نہیں۔ پس تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ سے روزیاں طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کی شکر گزاری کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ سورہ العنکبوت آیت ۱۷۔ مترجم)۔ اور یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔ سورہ یونس آیت ۱۸۔ مترجم)۔ کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا (اوروں کو) سفارشی مقرر کر رکھا ہے؟ آپؐ کہہ دیجیے کہ گو وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ سورہ الزمر، آیت ۴۳۔ مترجم)۔ کوئی چیز اللہ کے برابر اور ہمسر نہیں ہے۔

''شیطانی آیات'' کے متروک ہونے کے تھوڑی دیر بعد سورہ اخلاص نازل ہوئی:

آپؐ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے

نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے

چنانچہ توحید کا اصول مسلمانوں کی زندگی کا محور بن گیا۔ یہ محض خدا کی وحدانیت کا غیر مرئی مابعد الطبیعیاتی اقرار نہیں بلکہ دوسری تمام قرآنی تعلیمات کی طرح سراپا دعوت عمل تھا۔ چونکہ خدا کی ذات بے مثل ہے اس لیے مسلمانوں کو نہ صرف بتوں کی پرستش کرنے سے انکار کر دینا چاہیے بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ زندگی کے دوسرے حقائق انہیں خدائے واحد کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ دولت، وطن، خاندان، مادی خوشحالی بلکہ محبت یا حب الوطنی کے ارفع آئیڈیل اور نصب العین کو خدا پر فوقیت حاصل نہیں ہونی چاہیے اور انہیں خدا کے بعد دوسرا درجہ دینا چاہیے۔ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو باہم مربوط کریں۔ مسلمان خدا کو بلا شرکت غیرے اپنی اولیں ترجیح بنانے کی جدوجہد میں تمام تر توجہ خدائے واحد پر مرکوز کر دیتا ہے۔ غالباً یہی وہ وقت تھا جب اسلام

Marfat.com

قبول کرنے والے صحابہؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان آج بھی اسی عقیدے پر قائم ہیں۔

قریش کو توحید کے اس نظریے سے صدمہ پہنچا لیکن یہ نظریہ ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ادیان سے روشناس تھے اور یہ مذاہب ان کی اپنی روایات سے مماثلت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دین حنیف کے پیروکاروں کی ان کوششوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی جو وہ عرب میں توحید پرستی کے نظریے کو رائج کرنے کی غرض سے کر رہے تھے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مطمح نظر ان لوگوں سے مختلف تھا۔ بیشتر حنیف حرم کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن انہوں نے سماجی اصلاح کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ رسول کریمؐ نے خانہ کعبہ کے قرب و جوار میں رکھے گئے بتوں اور مورتیوں پر حملہ کر کے اس جانب اشارہ کیا کہ اس حالت میں حرم، جس پر مکہ کی معیشت کا دارومدار تھا، ایک بے کار محض معبد کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بدو قبائل کعبۃ اللہ کی زیارت و اکرام کے لیے حج نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے ان قبائلی بتوں اور مورتیوں کی عزت و توقیر کے لیے مکہ آتے جن کی اب قرآن کریم میں سخت ترین لفظوں میں مذمت کی گئی تھی۔ (Reza Aslan: No god but God: pp.43-46)۔ قریش خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے عموماً ''غرانیق'' کا واسطہ دیتے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ لیکن اب اس طریق کار کی ممانعت کر دی گئی اور اسے دھوکا اور فریب نظر قرار دے دیا گیا۔ طائف، جہاں لات کا بت نصب تھا، مکہ کو کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتا تھا۔ بہت سے قریش نے اس زرخیز نخلستان میں موسم گرما کے لیے مکان بنا رکھے تھے۔ اگر مسلمان ان کی دیوی لات کی توہین سے چشم پوشی کرتے تو اہل طائف ان کے ساتھ دوستانہ مراسم کس طرح برقرار رکھ سکتے تھے؟

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راتوں رات دشمن بن چکے تھے۔ قریش کے لیڈروں نے ایک وفد کو ابوطالب کے پاس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ لاتعلقی کا اعلان کر دیں۔ عرب میں کوئی شخص کسی باضابطہ محافظ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جس آدمی کو اس کے قبیلے سے خارج کر دیا جائے، اسے کسی سزا یا بدلے کے خوف کے بغیر قتل کیا جا سکتا تھا۔ ابوطالب کو حضورؐ سے دلی محبت تھی لیکن وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اب انہیں ایک مشکل صورت حال کا سامنا تھا۔ انہوں نے وقتی طور پر کوئی ہامی نہ بھری اور گول مول جواب دے کر انہیں ٹال دیا۔ چنانچہ قریش کا وفد یہ الٹی میٹم دے کر واپس چلا گیا: ''اے ابوطالب! ہم نے آپ سے استدعا کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو ہم سے روکے رکھیں لیکن آپ نے انہیں نہیں روکا۔ واللہ! ہم اس حالت میں صبر نہیں کر سکتے کہ ہمارے بزرگوں کو گالیاں دی جائیں اور عقل مندوں کو بے وقوف بنایا جائے اور ہمارے

Marfat.com

معبودوں میں عیب نکالے جائیں۔ یا تو ہم اسے اپنے متعلق ایسی باتیں کرنے سے روک دیں گے یا اس سے مقابلے کی ٹھہرائیں گے۔ پھر آپ اس میں دخل نہ دینا یہاں تک کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک برباد ہو جائے۔'' ابوطالب نے رسول کریمؐ سے کہا: ''مجھ پر رحم کر اور خود اپنی جان پر بھی رحم کر! مجھ پر ایسا بار نہ ڈال جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔'' آں حضرتؐ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ابوطالب بھی آپؐ کی حمایت سے دست کش ہو رہے ہیں۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؐ نے کہا:

''چچا جان! واللہ اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں اور شرط یہ ہو کہ میں اس معاملے کو چھوڑ دوں تو بھی میں اسے نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اسے غلبہ عطا کرے یا میں مر جاؤں۔'' اس کے بعد حضورؐ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب آپؐ وہاں سے واپس ہو گئے تو ابوطالب نے آپؐ کو واپس بلایا اور کہا: ''بھتیجے ادھر آؤ۔'' رسول اللہؐ ان کے پاس گئے تو ابوطالب نے کہا: ''جاؤ اور جو چاہو کہو۔ اللہ کی قسم! میں کسی معاوضے پر بھی تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحات ۱۶۷، ۱۶۸: The Life of Muhammad, p.119)

نبی کریمؐ عارضی طور پر محفوظ ہو گئے۔ جب تک ابوطالب آپؐ کے محافظ تھے اور موثر طور پر آپؐ کی حمایت کر سکتے تھے، مکہ میں کوئی شخص آپؐ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

ابوطالب نہایت باصلاحیت شاعر تھے چنانچہ انہوں نے ان اتحادی قبیلوں کی مذمت کے لیے ایک پرسوز قصیدہ لکھا جو آزمائش کی گھڑی میں بنی ہاشم کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ المطلب کے خاندان نے بنی ہاشم کے ساتھ یک جہتی کا اعلان کر دیا لیکن اس اچھی خبر کے ساتھ ہی ایک اہم شخصیت کے منحرف ہونے کی بھی اطلاع مل گئی۔ ابوطالب کا سوتیلا بھائی ابولہب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور نزول وحی کا شدید مخالف تھا لیکن اس نے قبیلے کے اندر پھوٹ سے بچنے کے لیے حضورؐ کی صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ اپنے دو بیٹوں کی منگنی کر دی تھی۔ اب اس نے اپنے بیٹوں کو مجبور کیا کہ وہ رسول کریمؐ کی صاحبزادیوں سے منگنی توڑ دیں تاہم اسلام قبول کرنے والے نفیس الطبع اور خوش وضع نوجوان عثمانؓ بن عفان حضرت رقیہؓ کے بے حد مداح تھے جو مکہ کی نہایت خوبصورت خاتون تھیں، انہوں نے آں حضرتؐ سے حضرت رقیہؓ کا رشتہ مانگ لیا۔

قریش کے سرداروں، خاص طور پر ان لیڈروں نے، جن کے خاندانوں کے کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اب حضورؐ کے خلاف غیظ و غضب سے بھرپور حملہ کر دیا۔ وہ جب بھی مسلمانوں کو خدائے واحد کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے سنتے تو تکبر اور غرور کے ساتھ مسلمانوں سے منہ موڑ لیتے اور دوسرے معبودوں کا نام سن کر بھرپور خوشی کا اظہار کرتے۔ (اور ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اسے سمجھیں اور

Marfat.com

ان کے کانوں میں بوجھ اور جب تو صرف اللہ ہی کا ذکر اس کی توحید کے ساتھ، اس قرآن میں کرتا ہے تو وہ روگردانی کرتے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۴۶: جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرنے لگتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا (اور کا) ذکر کیا جائے تو ان کے دل کھل کر خوش ہو جاتے ہیں۔ سورہ الزمر آیت ۴۵۔ مترجم)۔ قریش کے سرداروں کا تقاضا تھا کہ ہر شخص روایتی عقیدے پر کاربند رہے کیونکہ ان کے نزدیک یہی بہترین طرز عمل تھا! وہ قرآن حکیم کی تمام آیات سے سخت غضبناک تھے۔ حضورؐ نے تمام پرانے عقائد کو درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ خدائی پیغام وصول کرنے کے لیے قریش میں صرف آپؐ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟ (ان کے سردار یہ کہتے ہوئے چلے کہ چلو جی اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض ہے۔ سورہ ص۔ آیت ۶، مترجم)۔ وہ لوگ آں حضرتؐ کو (نعوذ باللہ۔ مترجم) دیوانہ کہنے لگے جس پر کسی جن کا سایہ ہے نیز یہ کہ آپؐ ایک جادوگر ہیں جنہوں نے اپنے سحر سے نوجوانوں کو باپ دادوں سے برگشتہ کر دیا ہے۔ (اور کافروں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک انہیں ڈرانے والا آ گیا اور کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر اور جھوٹا ہے۔ کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود کر دیا، واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ سورہ ص آیات ۴، ۵۔ مترجم)۔ حضورؐ سے جب یہ استفسار کیا گیا کہ آپؐ بھی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی طرح معجزے دکھا کر اپنے دعوئے نبوت کی تصدیق کریں تو آپؐ نے اعتراف کیا کہ ان لوگوں کی طرح آپؐ بھی ایک عام فانی انسان ہیں۔ (آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا انسان ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک اللہ ہی ہے سو تم اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے گناہوں کی معافی چاہو۔ اور ان مشرکوں کے لیے (بڑی ہی) خرابی ہے۔ (سورہ حم السجدہ آیت ۶۔ مترجم)۔

اپوزیشن لیڈروں میں مکہ کے بعض انتہائی طاقت ور قبیلوں کے سردار شامل تھے۔ ان میں سب سے نمایاں شخص ابوالحکم تھا۔ وہ ایک تنک مزاج اور جاہ طلب شخص تھا جو اسلام سے سخت پریشان تھا۔ اس کے علاوہ معمر اور لحیم شحیم امیہ ابن خلف اور حد درجہ ذہین ابوسفیان بھی مخالفین میں شامل تھا۔ ابوسفیان کسی زمانے میں آں حضرتؐ کا ذاتی دوست رہ چکا تھا۔ اس کا سسر عتبہ ابن ربیعہ اور بھائی شیبہ بھی حضورؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ بنی عامر کا سردار سہیل ابن عمرو، جو رسول اللہؐ کی طرح ہر سال کوہ حرا میں اعتکاف پر بیٹھتا تھا، اسلام لانے کے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا لیکن رسول کریمؐ کو توقع تھی کہ وہ اسلام قبول کر لے گا۔ مکہ کے کئی ذہین جنگجو نوجوان بھی، جن میں عمرو ابن العاص، خالد بن الولید اور سب سے بڑھ کر ابوالحکم کا

Marfat.com

بھانجا اور پرانے مذہب پر سختی سے کاربند پرجوش عمر ابن الخطاب شامل تھے، اپنے اسلام دشمن رویے کی وجہ سے مشہور تھے۔ جب دوسرے سرداروں کا حضورؐ کے خلاف رویہ محتاط تھا، اس وقت بھی عمر تشدد آمیز کارروائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب مکہ کے بااثر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور آپؐ نے یہ محسوس کر لیا کہ آپؐ کو غریب ترین لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دینی چاہیے جو آپؐ کے پیغام کو سننے کے لیے مضطرب تھے۔ یہ ایک اہم اور فیصلہ کن مرحلہ تھا جس کا قرآن کریم میں نہایت تند و تیز لہجے میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک دن حضورؐ مکہ کے رئیسوں کے ساتھ گفتگو میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ جب ایک نابینا شخص آپؐ سے کوئی سوال پوچھنے آیا تو آپؐ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس سے منہ پھیر لیا۔ (وہ ترش رو ہوا اور منہ موڑ لیا (صرف اس لیے) کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔ تجھے کیا خبر شاید وہ سنور جاتا یا نصیحت سنتا اور اسے نصیحت فائدہ پہنچاتی۔ جو بے پروائی کرتا ہے، اس کی طرف تو تو پوری توجہ کرتا ہے حالانکہ اس کے نہ سنورنے سے تجھ پر کوئی الزام نہیں۔ اور جو شخص تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ ڈر (بھی) رہا ہے، تو اس سے بے رخی برتتا ہے۔ (سورہ عبس آیات ۱ تا ۱۰۔ مترجم)۔ اس پر خدا نے حضورؐ کو تنبیہ کی کیونکہ ایک پیغمبر کے لیے لازم ہے کہ وہ معاشرے کے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اسے ''مروہ'' کے شاہانہ طور طریقوں سے قطع نظر مساوات کے اصول پر کاربند رہنا چاہیے۔ قرآن امیر اور غریب سب کے لیے برابر تھا۔ اس طرزِ عمل کو کفرانہ رویے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لفظ ''کافر'' کا ترجمہ عام طور پر ''ایمان نہ لانے والا'' کیا گیا ہے لیکن یہ ترجمہ نہایت گمراہ کن اور غلط ہے۔

(Cantwell Smith: Faith and Belief, pp39-40)

(Izutsu: Ethico Religious Concepts, p.66)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ابوالحکم اور ابوسفیان کے عقائد پر کوئی تنازع نہیں تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیشتر نظریات درست تھے۔ مثال کے طور پر انہیں یقین تھا کہ اللہ کائنات کا خالق اور کعبے کا مالک ہے۔ (اور اگر آپؐ ان سے دریافت کریں کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج چاند کو کام میں لگانے والا کون ہے؟ تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ، پھر کدھر الٹے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے، فراخ روزی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر آپؐ ان سے سوال کریں کہ آسمان سے پانی اتار کر زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کس نے کیا؟ تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے۔ آپؐ کہہ دیں کہ ہر تعریف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے بلکہ ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔

Marfat.com

(سورہ العنکبوت آیات ۶۱ تا ۶۳۔ مترجم)۔ اور ان کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کی کتاب کو سچا کرنے والی آئی حالانکہ پہلے یہ خود (اس کے ذریعے) کافروں پر فتح چاہتے تھے تو باوجود آجانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کافروں پر۔ (سورہ البقرہ آیت ۸۹۔ مترجم)۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے عقائد پر عمل نہیں کرتے تھے۔ وہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کے صحیح معنی کو نہیں مانتے تھے جس کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ انسان تمام معاملات میں خدائی احکام کی پیروی کرے۔ انسانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ کمزور لوگوں کو نفرت اور ظلم کا نشانہ بنانے کے بجائے خالق کائنات کی طرح ان پر ''نرمی اور شفقت کے پر پھیلائیں۔'' (اور رشتے داروں کا اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو۔ بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیات ۲۶، ۲۷۔ مترجم)۔

''کافر'' کے لفظ کا مادہ کفر (ناشکر گزاری) ہے جس کا مفہوم کسی ایسی چیز کو قبول کرنے سے گستاخی سے انکار کرنا ہے جو لطف و کرم اور فیاضی سے پیش کی جائے۔ جب خدا نے مکہ کے لوگوں کی جانب وحی نازل کی تو انہوں نے حقارت کے ساتھ اسے ٹھکرا دیا۔ قرآن حکیم ایمان و ایقان کے فقدان کی بنا پر کافروں کی زجر و توبیخ نہیں کرتا بلکہ تکبر اور گستاخی کی وجہ سے انہیں ہدف تنقید بناتا ہے۔

(Izutsu: Ethico Religious Concepts, pp.127-57)

یہ لوگ مغرور، خود بین اور دوسروں کو حقیر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مکہ کے ان غریبوں اور بے کسوں سے برتر ہیں جنہیں وہ دوسرے درجے کے شہری سمجھتے اور انہیں قابل نفرت تصور کرتے تھے۔ خدا پر کامل انحصار کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو غنی اور بے نیاز سمجھتے تھے اور اللہ یا کسی اور کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھے۔ کافرون اپنی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، وہ خود بینی اور خود رائی کے جذبے سے سرشار ہو کر اکڑ کر چلتے ہیں، دوسروں کے ساتھ جارحانہ اور ناگوار انداز میں مخاطب ہوتے ہیں اور اگر انہیں یہ خیال ہو کہ ان کی عزت اور وقار خطرے میں ہے تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ انہیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ان کا معیار زندگی سب لوگوں سے بلند ہے اور ان کا روایتی طرز زندگی ہر قسم کی نکتہ چینی سے مبرّیٰ ہے۔ (ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے، انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے، پوچھا کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے بھیجے گئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس بات پر یقین لائے ہو، ہم تو اس کے منکر

Marfat.com

ہیں۔ سورہ الاعراف آیات ۷۵، ۷۶۔ مترجم)۔ ہاں (ہاں) بے شک تیرے پاس میری آیتیں پہنچ چکی تھیں جنہیں تو نے جھٹلایا اور غرور و تکبر کیا اور تو تھا ہی کافروں میں۔ سورہ الزمر آیت ۵۹۔ مترجم۔ لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اترا کر نہ چل۔ کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز پست کر، یقیناً آوازوں میں سب سے بدتر آواز گدھوں کی ہے۔ سورہ لقمٰن آیات ۱۸، ۱۹۔ مترجم۔ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اپنی آیتوں اور کھلی دلیل کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کے لشکروں کی طرف، پس انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھے ہی سرکش لوگ، کہنے لگے کہ کیا ہم اپنے جیسے دو شخصوں پر ایمان لائیں حالانکہ خود ان کی قوم (بھی) ہمارے ماتحت تھی۔ سورہ المومنون آیات ۴۵ تا ۴۷۔ مترجم۔ جب کہ آپؐ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں مٹی سے انسان کو پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا)، اس نے تکبر کیا اور وہ تھا کافروں میں سے۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اے ابلیس! تجھے اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ کیا تو کچھ گھمنڈ میں آ گیا ہے؟ یا تو بڑے درجے والوں میں سے ہے۔ سورہ ص آیات ۷۱ تا ۷۵۔ مترجم)۔ یہ لوگ خدا کی وحی کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے اور اپنی چالاکی کا مظاہرہ کرنے کے لیے قرآن کریم کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے۔ (پس آپؐ اس حکم کو جو آپؐ کو کیا جا رہا ہے، کھول کر سنا دیجیے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجیے۔ آپؐ سے جو لوگ مسخراپن کرتے ہیں، ان کی سزا کے لیے ہم کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود مقرر کرتے ہیں، انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ سورہ الحجر آیات ۹۴ تا ۹۶۔ مترجم)۔ یہ منکرین تجھے جب بھی دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی اڑاتے ہیں کہ کیا یہی وہ ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر برائی سے کرتا ہے اور وہ خود ہی رحمٰن کی یاد کے بالکل ہی منکر ہیں۔ (سورہ الانبیا آیت ۳۶۔ مترجم)۔ حال یہ ہے کہ ان کا بدلہ جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کو مذاق میں اڑایا۔ (سورہ الکہف آیت ۱۰۶۔ مترجم)۔ اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں، پس ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا آپؐ کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ قوم نوح نے اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ اور ہر امت نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ذریعے کج بحثیاں کیں تاکہ ان سے حق کو بگاڑ دیں پس میں نے ان کو پکڑ لیا، سو میری طرف سے کیسی سزا ہوئی۔ (سورہ المومن آیات ۴، ۵۔ مترجم)۔ اور قریب ہے کہ کافر اپنی تیز نگاہوں سے آپؐ کو پھسلا دیں، جب کبھی قرآن سنتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ تو ضرور دیوانہ ہے۔ (سورہ القلم آیت ۵۱۔ مترجم)۔ یہ لوگ کسی نئی بات پر غور

Marfat.com

کرنے کے قابل بھی نہیں۔ان کے دلوں پر پردے ہیں اور وہ زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔یہ (ایسی) کتاب ہے جس کی آیتوں کی واضح تفصیل کی گئی ہے (اس حال میں کہ) قرآن عربی زبان میں ہے اس قوم کے لیے جو جانتی ہے۔خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا ہے، پھر بھی ان کی اکثریت نے منہ موڑ لیا اور وہ سنتے ہی نہیں۔اور انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے، ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہم میں اور تجھ میں ایک حجاب ہے، اچھا تو اب اپنا کام کیے جا ہم بھی یقیناً کام کرنے والے ہیں۔(سورہ حم سجدہ آیات ۳ تا ۵۔مترجم)۔جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے۔(سورہ المطففین آیات ۱۳،۱۴۔مترجم)۔کافروں کو آپؐ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے، یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔(سورہ البقرہ آیات ۶،۷۔مترجم)۔

کافرون کا سب سے بڑا عیب اور خامی جاہلیت تھی۔مسلمان روایتی طور پر اس اصطلاح کو عرب میں ظہور اسلام سے پہلے کے دور سے منسوب کرتے ہیں چنانچہ اس کا عموماً یہ ترجمہ کیا جاتا ہے: ''جاہلیت کا دور۔'' اگرچہ جہل کا مصدر جہالت کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کا بنیادی مطلب ہے ''تنک مزاجی اور زود رنجی۔'' اس لفظ سے عزت اور وقار کے معاملے میں سریع الحسی اور شدید اثر پذیری کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے تکبر، زیادتی اور بے اعتدالی اور سب سے بڑھ کر تشدد اور انتقام لینے کے پرانے رجحان کی عکاسی ہوتی ہے۔

(Izutsu: Ethico Religious Concepts, pp.28-45)۔جاہلی دور کے لوگ اس قدر مغرور تھے کہ وہ اسلام کے سامنے سرنگوں ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ایک کریم شخص اپنا طرزِ زندگی تبدیل کر کے غلام (عبد) کیوں بنے اور زمین پر ناک رکھ کر دوسرے لوگوں کی طرح سجدہ ریز کیوں ہو؟ مسلمان اپنے سب سے بڑے دشمن ابوالحکم کو اس لیے ''ابوجہل'' نہیں کہتے تھے کہ اسے اسلام کا علم نہیں تھا، وہ اسلام کی تعلیمات کو خوب سمجھتا تھا لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ عاقبت نااندیشی کے ساتھ پوری طاقت اور جوش و خروش سے متکبرانہ انداز میں اسلام کی مخالفت کرتا تھا۔بہ ہر حال اس زمانے میں قبائلی جبلت کا رنگ اس قدر گہرا تھا جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ طویل عرصے سے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی مسلمانوں سے دور جاہلیت کی علامتیں ظاہر ہوتی رہیں۔جاہلیت کے خصائص کو راتوں رات ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ خصوصیات مخفی خطرے کی طرح بدستور موجود رہیں۔یہ اندیشہ ہمیشہ برقرار رہتا کہ جاہلی جذبات کسی بھی لمحے بھڑک اٹھیں گے جس سے تباہی پھیل جائے گی۔

Marfat.com

قرآن کریم نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ دور جاہلیت کی روایات سے مغلوب ہونے کے بجائے حلم کے نظریے کو اپنائیں جو عربوں کا روایتی جوہر ہے۔ اس نظریے پر کاربند مرد اور عورتیں صبر و تحمل، استقلال مزاجی اور رحم کے اوصاف سے متصف تھے۔ (Izutsu: Ethico Religious Concepts, p.28)۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ مشکل ترین حالات میں بھی اپنے غصے پر قابو پائیں، پرسکون رہیں اور ایسے موقعوں پر آگ بگولا نہ ہوں چنانچہ مسلمان فوری طور پر کوئی جوابی کارروائی نہ کرتے، جب کوئی انہیں زخم لگاتا تو وہ بدلہ لینے کا کام اللہ پر چھوڑ دیتے۔ (آپؐ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے نبیوں سے وعدہ خلافی کرے گا، اللہ بڑا ہی غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ سورہ ابراہیم آیت ۴۷۔ مترجم۔ اور جسے وہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ غالب اور بدلہ لینے والا نہیں ہے۔ سورہ الزمر آیت ۳۷۔ مترجم۔ ایک بستی کے رہنے والے بھی بڑے ظالم تھے جن سے (آخر) ہم نے انتقام لے ہی لیا۔ یہ دونوں شہر کھلے (عام) راستے پر ہیں۔ سورہ الحجر آیات ۷۸، ۷۹۔ مترجم۔ اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی اپنے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، وہ ان کے پاس دلیلیں لائے، پھر ہم نے گناہگاروں سے انتقام لیا۔ ہم پر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔ سورہ الروم آیت ۴۷۔ مترجم)۔ حلم سے مثبت اعمال کی ترغیب ملتی اور اگر مسلمان حلم پر کاربند رہیں تو وہ نادار، کمزور اور بے کس لوگوں کی دیکھ بھال کرتے، غلاموں کو آزاد کرتے اور بے سہارا لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں خواہ وہ خود بھوکے ہی کیوں نہ ہوں۔ (اور کیا سمجھا کہ گھاٹی ہے کیا؟ کسی گردن (غلام لونڈی) کو آزاد کرنا۔ یا بھوک والے دن کھانا کھلانا۔ کسی رشتے دار یتیم کو۔ یا خاکسار مسکین کو۔ پھر ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو ایمان لاتے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ سورہ البلد آیات ۱۲ تا ۱۷۔ مترجم)۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ لطف و کرم اور شائستگی کا مظاہرہ کریں۔ مسلمان مرد اور عورتیں امن کے علمبردار ہیں۔ (رحمٰن کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے۔ سورہ الفرقان آیت ۶۳)۔

''شیطانی آیات'' کے قصے کے بعد کافروں کے ساتھ تنازعے نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ ابوجہل ہر روز کسی مسلمان کو جلی کٹی سناتا، گالیاں بکتا اور ان پر جھوٹے بہتان باندھتا اور افواہیں پھیلاتا۔ اس نے مسلمان تاجروں کو دھمکی دی کہ وہ انہیں تباہ کر دے گا۔ ''کمزور'' مسلمانوں کو وہ مارتا پیٹتا۔ کفار ان مسلمانوں کو، جن کے محافظ مضبوط تھے، نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے البتہ وہ غلاموں اور قبائلی سرپرستی سے محروم مسلمانوں پر حملے کرتے۔ جمح قبیلے کا سردار امیہ حبشہ کے غلام بلالؓ کو ایذائیں پہنچاتا، ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ کر انہیں

Marfat.com

تپتے ہوئے سورج کے سامنے کھڑا کر دیتا۔ حضرت ابوبکرؓ بلالؓ کے مصائب کو برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے بلالؓ کو امیہ سے خرید کر آزاد کر دیا۔ انہوں نے ایک مسلمان لونڈی کو بھی، جسے عمر ابن الخطاب کوڑے لگا رہے تھے، آزادی دلائی۔ اسلام قبول کرنے والے کئی نوجوانوں کو ان کے خاندانوں نے گھروں میں قید کر دیا بلکہ انہیں بھوکا رکھ کر مارنے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ صورت حال اس قدر سنگین ہوگئی کہ نبی کریمؐ نے ملت اسلامیہ کے زیادہ کمزور لوگوں کو حبشہ بھیج دیا جہاں کے عیسائی گورنر نے انہیں پناہ دے دی۔ اب یہ تکلیف دہ اور ناقابل یقین حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ مکہ میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

جاہلیت کے ماحول میں پرورش پا کر جوان ہونے والے مسلمانوں کے لیے حلم کا اظہار اور دوسرا گال پیش کرنا بہت مشکل تھا۔ حالت یہ ہوگئی کہ بعض اوقات حضورؐ کو اپنے سکون اور دل جمعی کو برقرار رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی۔ قرآن حکیم میں نازل ہونے والی ایک ابتدائی سورت میں رسول اللہؐ کے چچا ابولہب اور اس کی بیوی کی سخت سرزنش کی گئی جو آپؐ کے گھر کے باہر کانٹے بچھا دیتی تھی۔ (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہوگیا۔ نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا۔ اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔ اس کی گردن میں پوست کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ سورت تبت آیات ۱ تا ۵۔ یہ واحد موقع ہے جب قرآن میں آں حضرتؐ کے کسی دشمن کا نام لیا گیا ہے۔ مترجم)۔ ایک موقعے پر رسول کریمؐ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ آپؐ نے سنا کہ قریش کے بعض سردار توہین آمیز کلمات کے ذریعے آپؐ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ حضورؐ نے کچھ دیر کے لیے غصے پر قابو پا لیا۔ اس دوران آپؐ نے تیسری مرتبہ کعبے کا طواف مکمل کر لیا۔ قریش کے سرداروں نے کچھ باتیں طعن کے طور پر کہیں جس کا اثر نبی کریمؐ کے چہرہ مبارک پر نظر آنے لگا۔ آپؐ ٹھہر گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے گروہ قریش! کیا تم سن رہے ہو! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہارے پاس ایک پاک چیز لایا ہوں۔'' رسول اللہؐ کے ان لفظوں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور ان کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ لیکن اگلے روز ان لوگوں کی ہمت بحال ہو چکی تھی چنانچہ نبی کریمؐ جب خانہ کعبہ پہنچے تو انہوں نے حضورؐ کو گھیرے میں لے کر آپؐ پر حملہ کر دیا اور آپؐ کی چادر کو دونوں پلو ملنے کی جگہ سے پکڑ لیا۔ پھر ابوبکرؓ آپؐ کی مدافعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ روتے اور یہ کہتے جاتے تھے: ''اے لوگو! کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحات ۱۸۳، ۱۸۴: The Life of Muhammad, pp.130-31)۔

لیکن قریش کے اس قسم کے رویے سے بعض اوقات منفی نتائج برآمد ہوتے۔ مثال کے طور پر ایک دن

Marfat.com

ابوجہل نے آں حضرتؐ کے ساتھ بدزبانی کی تاہم حضورؐ نے اس سے کچھ نہ کہا اور گھر واپس آ گئے۔ اسی روز شام کو رسول اللہؐ کے چچا حمزہ، جو اپنی جسمانی طاقت کے باعث مکہ میں مشہور تھے۔ شکار کھیل کر اس حال میں خانہ کعبہ پہنچے کہ تیر کمان ان کے شانوں سے لٹک رہی تھی۔ راستے میں ایک لونڈی نے نبی کریمؐ کے ساتھ ابوجہل کی بدزبانی کے متعلق انہیں بتایا تو حمزہ، جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ وہ تیزی سے ابوجہل کی طرف بڑھے اور اس زور سے کمان اس کے سر پر ماری کہ وہ زخمی ہو گیا۔ حمزہ نے کہا: ''کیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دیتا ہے؟ لے میں بھی انہیں کے دین پر ہوں۔ میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو وہی برتاؤ مجھ سے بھی کر۔'' ابوجہل نے اپنے ساتھیوں کو حمزہ کی طرف بڑھنے سے روک دیا اور کہا: ''ابوعمارہ کو جانے دو کیونکہ واللہ! میں نے بھی ان کے بھتیجے کو بری بری گالیاں دی ہیں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۸۵: The Life of Muhammad, p.131)۔

حضرت حمزہؓ صدق دل سے پکے مسلمان بن گئے لیکن رسول کریمؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپؐ کے چچا اس طریقے سے دائرہ اسلام میں داخل ہوں۔ ۶۱۶ عیسوی کے آخر میں ایک اور شخصیت نے حیرت انگیز طور پر اسلام قبول کر لیا۔ عمر ابن الخطاب نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ ہاتھ میں تلوار لے کر کوہ صفا کے دامن میں واقع اس مکان کی طرف چل پڑے جہاں سہ پہر کو رسول اللہؐ آرام فرما رہے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے شوہر مسلمان ہو چکے ہیں۔ عمر کوہ صفا پر جانے کے لیے ابھی راستے میں ہی تھے کہ خفیہ طور پر مسلمان ہونے والے اپنے ہی قبیلے کے ایک شخص سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے عمر کی توجہ ہٹانے کے لیے ان سے کہا کہ وہ واپس جا کر دیکھیں کہ خود ان کے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ سن کر عمر دوڑتے ہوئے واپس گئے اور جب گلی کے کونے سے مڑے تو انہیں اپنی کھڑکی سے قرآن مجید کے الفاظ سنائی دیے۔ ''یہ کس کے گنگنانے کی آواز تھی جو میں نے سنی؟'' عمر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔ ان کی بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا: ''نہیں، تم نے کچھ نہیں سنا۔'' اس پر عمر نے کہا: ''کیوں نہیں، واللہ! میں نے سنا ہے اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ تم دونوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔'' جب عمر مارنے کے لیے فاطمہؓ اور سعیدؓ کی طرف بڑھے تو خبابؓ، جنہیں ان لوگوں نے دعوت دی تھی کہ وہ ان کے گھر آ کر انہیں قرآن کی نئی سورت پڑھ کر سنائیں، تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ عمر کی بہن اٹھیں کہ انہیں اپنے شوہر سے روکیں۔ عمر نے فاطمہؓ کو پٹخ دیا اور انہیں ایسا مارا کہ ان کا سر زخمی ہو گیا۔ عمر نے اپنی بہن کا خون دیکھا تو اپنے کیے پر پچھتائے۔ ان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور وہ مارنے سے رک گئے۔ عمر نے سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات کو اٹھا کر پڑھنا

Marfat.com

شروع کر دیا جو خبابؓ سے تیزی میں گر گئی تھیں۔ عمر عکاظ کے میلے میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں جج کے فرائض انجام دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ وہ کوئی بے مثل کلام پڑھ رہے ہیں۔ یہ کلام عرب کی روایتی شاعری سے بالکل مختلف تھا۔ ''یہ کلام کس قدر اچھا اور کتنا عظمت والا ہے!'' انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ قرآن کریم کے حسن نے عمر کی اسلام سے شدید نفرت اور تعصب کو اس داخلی اثر پذیری میں تبدیل کر دیا جس سے وہ اب تک روشناس نہیں تھے۔ عمر نے اپنی تلوار کو تیزی سے دوبارہ اچک لیا اور مکہ کی گلیوں میں سے دوڑتے ہوئے جبل صفا کے اس مکان پر پہنچ گئے جہاں رسول اللہؐ قیام فرما ہے تھے۔ ''اے خطاب کے بیٹے! تجھے کون سی چیز یہاں لے آئی ہے؟'' حضورؐ نے عمر سے کہا۔ عمر نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! میں آپؐ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس چیز پر ایمان لاؤں جو اللہ کی طرف سے آپ لائے ہیں۔'' پھر آں حضرتؐ نے اس قدر زور سے تکبیر کہی کہ جو صحابہؓ حضرت عمرؓ کی دہشت کی وجہ سے اس وسیع مکان میں چھپ گئے تھے، جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے ہیں۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۲۷: The Life of Muhammad, p.157)۔

لیکن محمد ابن اسحاق نے جناب عمرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں خود ان کی زبانی ایک اور روایت بیان کی ہے جو اس قدر ڈرامائی نہیں البتہ برابر اہمیت کی حامل ہے: ''میں اسلام سے بہت دور بھاگنے والا تھا اور جاہلیت کے زمانے میں شراب پیا کرتا تھا۔ اس کا بڑا شوقین اور خوب پینے والا تھا۔ ہماری ایک مجلس عمر بن عبد کے کنبہ والوں کے پاس تھی جس میں قریش جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک رات میں اٹھنے بیٹھنے والوں کے پاس جانے کے ارادے سے اس مجلس کی طرف چلا اور وہاں پہنچا تو ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ پایا۔ میں نے سوچا کہ فلاں شراب فروش کے پاس، جو مکہ میں شراب بیچا کرتا تھا، جانا چاہیے، شاید وہاں سے شراب مل سکے اور میں کچھ پی سکوں۔ پھر میں چلا اور اس کے پاس پہنچا تو اسے بھی نہ پایا۔ میں نے سوچا بہتر ہو میں کعبۃ اللہ جاؤں اور اس کے سات یا ستر چکر لگاؤں۔ پھر میں مسجد میں آیا کہ کعبۃ اللہ کا طواف کروں تو رسول اللہؐ کو دیکھا، آپؐ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب میں نے آپؐ کو دیکھا تو دل میں کہا: ''واللہ! آج رات محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف توجہ کروں اور سنوں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ میں کعبے کے غلاف کے اندر ہو گیا اور آہستہ آہستہ آپؐ کے قریب پہنچ گیا۔ رسول اللہؐ کھڑے نماز پڑھتے اور قرآن کی تلاوت فرماتے رہے یہاں تک کہ میں آپؐ کے مقابل ہو گیا۔ آپؐ کے اور میرے درمیان غلاف کعبہ کے سوا کوئی اور چیز حائل نہیں تھی۔ جب میں نے قرآن سنا تو میرے دل میں رقت پیدا ہوئی، میں رو پڑا اور اسلام مجھ میں داخل ہو گیا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۲۸: The Life of Muhammad, p.158)۔ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام سے

Marfat.com

مخالفین کو سخت دھچکا لگا لیکن چونکہ عمرؓ اپنے قبیلے کی حفاظت میں تھے، اس لیے انہیں نقصان پہنچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ابوجہل نے اب ہاشم اور المطلب قبیلوں کا مقاطعہ کرنے کے لیے تمام قبیلوں سے ایک معاہدہ لکھوا لیا جس کی رو سے حضورؐ کے قبیلوں کے ساتھ شادی بیاہ یا خرید و فروخت کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ چنانچہ ان دونوں قبیلوں کے افراد، مسلمان اور غیر مسلم، شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے جو آخر کار ایک یہودی باڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کے اہل خانہ شعب ابی طالب میں پہنچے تو ابولہب اور اس کا خاندان عبد شمس کے علاقے میں وارد ہو گیا۔ اس بائیکاٹ کا مقصد ان دونوں قبیلوں کو بھوکے مارنا نہیں، انہیں قبیلے سے علیحدگی اختیار کرنے کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا۔ اگر رسول اللہؐ مکہ کی مذہبی زندگی سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو اس صورت میں وہ اہل مکہ کی معیشت سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ (Aslan: No god but God: p.46)۔ یہ مقاطعہ تین سال کے بعد ختم ہوا۔ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے رشتے دار قبیلوں میں اس بائیکاٹ کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ یہ قبیلے ان لوگوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ، جن کا تعلق دوسرے قبیلوں سے تھا، کھانے پینے کی چیزیں شعب ابی طالب میں بھیجتے رہے۔ مکہ کا ہشام بن عمرو، جس کے بنی ہاشم میں بہت سے رشتے دار تھے، غلے کے اونٹ اکثر رات کے وقت شعب ابی طالب میں لایا کرتا تھا۔ جب وہ درے کے دہانے پر آتا تو اونٹ کی نکیل نکال ڈالتا اور اس کے پہلو پر مارتا۔ اس طرح وہ اونٹ درے کے اندر لوگوں کے پاس پہنچ جاتا۔ ایک دن ابوجہل نے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم ابن حزام کو روکا جو اپنی پھوپھی کے لیے کچھ گیہوں اٹھا کر لیے جا رہا تھا۔ اس پر دونوں میں تکرار ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے حکیم کی حمایت کر دی۔ کیا ابوجہل سنجیدگی سے حکیم کو اپنی پھوپھی کے لیے لے جانے والا غلہ روک رہا تھا؟ جب ابوجہل نے انکار کیا تو قریش کے اس شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی لے کر اسے مارا، اس کا سر زخمی کر دیا اور خوب لاتیں لگائیں۔

قریش کے اس مقاطعے کے دوران قرآن کریم نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ دوسرے پیغمبروں۔۔۔ یوسف، نوح، یونس، موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام نے بھی اپنی اپنی قوموں کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنا رویہ درست کر لیں لیکن جب انہوں نے انکار کیا تو ان کے معاشرے منہدم ہو گئے، اس لیے کہ وہ کائنات کے بنیادی اصولوں پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ (بستیوں کی بعض خبریں جنہیں ہم تیرے سامنے بیان فرما رہے ہیں، ان میں سے بعض تو موجود ہیں اور بعض (کی فصلیں) کٹ گئی ہیں۔ سورہ ہود آیت ۱۰۰ مترجم)۔ جانوروں، مچھلیوں یا پودوں کے برعکس، جو اس لیے فطری اعتبار سے مسلمان ہیں کیونکہ وہ جبلی طور پر ان بنیادی قوانین پر کاربند ہیں، خدا نے انسان کو فکر و عمل کی مکمل

Marfat.com

آزادی دی ہے۔ جب یہ لوگ کمزوروں پر ظلم کرتے اور ناداروں اور بے کسوں کو اپنی دولت میں حصہ دار نہیں بناتے تو وہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مچھلی خشک زمین پر زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ ان حالات میں تباہی ناگزیر تھی۔ لیکن قرآن مجید مسلمانوں پر مسلسل یہ زور دیتا رہا کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور اپنے دشمنوں سے ذاتی انتقام لینے سے گریز کریں۔

قریش کے بعض لوگ بھی امن کے خواہاں تھے۔ بائیکاٹ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ایک مختصر وفد نے ایک معزز سردار کی قیادت میں رسول کریمؐ کے ساتھ رابطہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ سے مکہ کا پورا شہر ایک سال اللہ اور اگلے سال دوسرے معبودوں کی پرستش کیا کرے گا۔ لیکن آں حضرتؐ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے سورہ کافرون نازل ہوئی جس میں پرامن بقائے باہمی کا اصول متعین کر دیا گیا:

آپؐ کہہ دیجیے کہ اے کافرو!

نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو

نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں

اور نہ میں عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے

لوگ مختلف چیزوں کی پرستش کرتے ہیں لیکن قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے الگ ہو چکی ہے اس لیے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ سورہ البقرہ آیت ۲۵۶۔ مترجم)۔ دین کا مطلب صرف مذہب ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق طرز زندگی اور اخلاقی قانون سے بھی ہے۔ ہر فرد کا اپنا دین ہے اس لیے اس میں طاقت کے استعمال یا جبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

آخر خونی رشتے بائیکاٹ ختم کرانے کا سبب بنے۔ قریش کے چار افراد نے، جن کی بنی ہاشم اور المطلب خاندانوں سے رشتے داریاں تھیں، مقاطعہ ختم کرنے کی درخواست کی اور ابوجہل کے شدید احتجاج کے باوجود دوسرے تمام سردار بائیکاٹ ختم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس سے مسلم برادری مسرور ہو گئی۔ یہ خبر سنتے ہی کئی مہاجرین حبشہ سے واپس مکہ آ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ بدترین حالات کا خاتمہ ہو گیا ہے چنانچہ انہوں نے بہتر مستقبل کے بارے میں امیدیں باندھ لیں۔ ۶۱۹ عیسوی کے شروع میں جناب خدیجہؓ انتقال کر گئیں۔ وہ ساٹھ

Marfat.com

کے عشرے میں تھیں اور کھانے پینے کی چیزوں کی شدید قلت کے باعث ان کی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی قریب ترین ساتھی اور حقیقی مددگار تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد ان کا کوئی متبادل نہیں تھا بلکہ وفا شعار ابوبکرؓ یا پر جوش عمرؓ بھی آں حضرتؐ کو جناب خدیجہؓ جیسی قلبی حمایت فراہم نہ کر سکے۔ ابتدائی سیرت نگار ۶۱۹ عیسوی کو عامۃ الحزن یعنی غم کا سال قرار دیتے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک اور شخصیت کی وفات کے زیادہ دوررس اثرات ظاہر ہوئے۔ ابوطالب مالی اعتبار سے تباہ ہو چکے تھے لیکن مقاطعے کی وجہ سے وہ جسمانی لحاظ سے بھی سخت کمزور ہو گئے۔ اسی سال کے آخر میں وہ بیمار ہوئے اور وفات پا گئے۔ اب ابولہب بنی ہاشم کا نیا سردار تھا۔

Marfat.com

تیسرا باب

ہجرت

مکہ میں ہر شخص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کمزور اور غیر محفوظ حیثیت سے فوری طور پر آگاہ ہو گیا۔ ابولہب حضورؐ کی محافظت سے دست بردار نہ ہوا۔ ہر قبائلی سردار سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کو تحفظ فراہم کرے گا اور اگر ابولہب قبیلے کا نیا سربراہ بنتے ہی اس فریضے کو انجام دینے میں ناکام ہو جاتا تو اسے اس کی کمزوری پر محمول کیا جاتا۔ لیکن ظاہر تھا کہ آں حضرتؐ کے ساتھ دلی عناد کی بنا پر اس کی محافظت کے پیچھے حسد اور عداوت کارفرما تھی۔ آپؐ کے ہمسائے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہوئے آپؐ کو پریشان کرنے کے لیے نماز کے دوران بھیڑ کی اوجھڑی آپؐ کے سامنے رکھ دیتے بلکہ ایک مسخرے نے تو اوجھڑی کو کھانا پکانے کے برتن میں ڈال دیا۔ ایک دن جب رسول اللہؐ شہر سے گزر رہے تھے تو ایک قریشی نوجوان نے آپؐ پر غلاظت ڈال دی۔ جب حضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو وہ زار و قطار رونے لگیں۔ وہ روتی ہوئی آپؐ کے جسم مبارک سے گندگی صاف کرتی جاتی تھیں۔ ''میری ننھی بچی مت رو۔'' آں حضرتؐ نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا: ''خدا تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا''۔ پھر آپؐ نے رنج اور افسردگی کے عالم میں خود کلامی کرتے ہوئے کہا: ''ابو طالب کی زندگی میں قریش نے میرے ساتھ اس قسم کا سلوک کبھی نہیں کیا تھا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۷۸)۔

رسول کریمؐ کی کمزوری سے کئی دوسرے مسلمانوں کی پوزیشن بھی متاثر ہوئی۔ مثال کے طور پر بائیکاٹ کے باعث حضرت ابوبکرؓ کا کاروبار تباہ ہو گیا۔ وہ جمح قبیلے کے علاقے میں رہتے تھے۔ اس قبیلے کے معمر اور فر بہ

Marfat.com

سردار امیہ بن خلف کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ امیہ ایذا رسانیوں کے ابتدائی دور میں بلالؓ کو تپتی دھوپ میں کھڑا رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ مکہ کے ایک معزز تاجر سے بھی یہی سلوک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابوبکرؓ اور ان کے عم زاد طلحہؓ کو اکٹھے باندھ کر شرمناک حالت میں تپتے ہوئے سورج کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ابوبکرؓ کا قبیلہ تیم اس قدر کمزور تھا کہ ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو یہ احساس ہو گیا کہ مکہ میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ چنانچہ وہ دوسرے مسلمان مہاجرین کے ساتھ شامل ہونے کے لیے حبشہ روانہ ہو گئے۔ لیکن راستے میں قریش کے اتحادی خانہ بدوش قبائل کے سردار ابن دغنہ سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ ابوبکرؓ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور انہیں واپس مکہ لا کر اپنی پناہ میں لے لیا۔ چونکہ قریش کے سردار ابن دغنہ کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے خواہش مند تھے اس لیے انہوں نے اس انتظام سے اتفاق کر لیا تاہم انہوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ابوبکرؓ لوگوں کے سامنے نہ تو نماز پڑھیں گے اور نہ ہی قرآن کی تلاوت کریں گے۔ قریش نے کہا: ''ابوبکر طلسماتی شخصیت کے مالک ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان کے آباء واجداد کے دین سے منحرف کر دیں گے۔'' چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تنہا عبادت کرنے لگے اور انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد بنالی۔

لیکن یہ صورت حال واضح طور پر غیر اطمینان بخش تھی۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے طائف کے خوشگوار اور زرخیز نخلستان میں ایک نیا محافظ تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی جس سے آپؐ کی حد درجہ مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس مایوسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپؐ کی طرف سے لات دیوی کی مذمت کے بعد ثقیف قبیلے کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ حضورؐ اس قبیلے کے تین سرکردہ بھائیوں کے پاس گئے، انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور ان سے کہا کہ وہ آپؐ کی حفاظت کریں۔ لیکن یہ لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ انہوں نے اپنے غلاموں کو طائف کی گلیوں میں آپؐ کا پیچھا کرنے کے لیے بھیج دیا۔

ہجوم سے بچنے کے لیے آں حضرتؐ عتبہ بن ربیعہ کے باغ میں جانے پر مجبور ہو گئے جو اس وقت باغ میں بیٹھا یہ واقعہ دیکھ رہا تھا۔ عتبہ مکہ کے کافروں کا سرغنہ تھا جس نے گرمیاں گزارنے کے لیے طائف میں مکان بنا رکھا تھا۔ عتبہ کا بھائی شیبہ بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ انہوں نے قریش کے ایک شخص کو اس افسوس ناک حالت میں دیکھا تو سخت رنجیدہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام سے کہا کہ وہ انگوروں کا ایک خوشہ تھالی میں رکھ کر آپؐ کے پاس لے جائے۔ عربوں میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ وہ ہنگامی حالت میں کسی دیوی یا جن کی پناہ حاصل کرتے تھے لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس موقعے پر خدا کی پناہ لی:

''اے اللہ! میں اپنی کمزوری، ضعف تدبیر اور لوگوں میں اپنی ذلت کی شکایت تجھی

Marfat.com

سے کرتا ہوں۔ اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے! تو کمزوروں کو ترقی پر پہنچانے والا ہے اور تو میری پرورش کرنے والا ہے، تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ (کیا) ایسے دور والے کے جو مجھ سے ترش رو ہو کر پیش آتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملے کا مالک بنا دیا گیا ہے، اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں تو میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ مگر تیری عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے اندھیرے دور ہوتے ہیں، دنیا و آخرت کے معاملے سدھرتے ہیں۔ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا مجھ پر خفگی ہو، (مجھے) تیری ہی رضامندی کی طلب ہے حتیٰ کہ تو راضی ہو جائے اور تیرے سوا نہ تو کسی میں ضرر دور کرنے کی قوت ہے اور نہ نفع حاصل کرنے کی۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۸۰: The Life of Muhammad, p.193)۔

محمد ابن اسحاق نے رسول کریمؐ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ ایک غیر معمولی کام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روحانی صداقت کا لمحہ تھا۔ اب آپؐ نے اس سچائی کو پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کر لیا کہ آپؐ کا محافظ اور سلامتی کا ضامن صرف اللہ ہے۔

خدا نے آں حضرتؐ کی دعا کا فوری جواب دیا کیونکہ جیسے ہی آپؐ نے دعا ختم کی، عتبہ کا غلام لڑکا عداس انگوروں کا ایک خوشہ تھالی میں رکھ کر آپؐ کے پاس پہنچ گیا۔ عداس ایک عیسائی تھا اور حضورؐ کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کا تعلق یونس علیہ السلام کے شہر نینویٰ سے تھا۔ رسول اللہؐ نے عداس کو بتایا کو حضرت یونسؑ آپؐ کے بھائی تھے کیونکہ آپؐ بھی اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سنتے ہی عداس آپؐ پر جھک گیا اور آپؐ کا سر مبارک، ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا۔ اس واقعے کو دیکھ کر عتبہ سخت پریشان ہو گیا۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص کے ساتھ غیر متوقع ملاقات کے بعد نبی کریمؐ کا احساس تنہائی کم ہو گیا۔ اس واقعے سے آپؐ کو یہ اشارہ بھی مل گیا کہ اگرچہ عربوں نے آپؐ کے پیغام کو مسترد کر دیا ہے، اس کے باوجود عرب کے باہر اس وسیع و عریض دنیا میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جو آپؐ کے مشن کی اہمیت کو جاننے لگیں گے۔ جب آپؐ نے واپس مکہ جانے کے لیے سفر شروع کیا تو آپؐ مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے راستے میں نماز پڑھنے کے لیے نخلہ کے چھوٹے سے نخلستان میں قیام کیا جہاں جنوں کے ایک گروہ نے آپؐ سے قرآن کریم سنا۔ لفظ جن عربوں کے متلون مزاج جن بھوتوں سے منسوب نہیں بلکہ اسے ان ''اجنبی لوگوں'' کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جنہیں اس سے پہلے دیکھا نہ گیا ہو۔ قرآن مجید یہ عندیہ دیتا ہے کہ ممکن ہے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے

Marfat.com

قرآن سننے والے مسافر، جو وادی نخلہ میں چھپے بیٹھے تھے، یہودی ہوں۔ یہ لوگ قرآن پاک کے حسن اور فصاحت و بلاغت سے بہت متاثر ہوئے اور جب وہ اپنے گھروں کو لوٹے تو انہوں نے اپنی قوم کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا: ''اور یاد کرو! جب کہ ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو تیری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، پس جب (نبی) کے پاس پہنچ گئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب پڑھ کر ختم ہو گیا تو اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے لوٹ گئے۔ کہنے لگے اے ہماری قوم! ہم نے یقیناً وہ کتاب سنی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے۔ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، جو سچے دین اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم! اللہ کے بلانے والے کا کہا مانو، اس پر ایمان لاؤ تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں المناک انجام سے پناہ دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے بلانے والے کا کہا نہ مانے گا پس وہ زمین میں کہیں (بھاگ کر اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتا، نہ اللہ کے سوا اور کوئی اس کے مددگار ہوں گے، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ سورہ الاحقاف آیات ۲۹ تا ۳۲۔ مترجم۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپؐ کہہ دیں کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (قرآن) سنا اور کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔ سورہ الجن آیت ۱۔ مترجم)۔

رسول اللہؐ کے افق اب وسیع ہونے لگے۔ اس سے پہلے آپؐ کو یقین تھا کہ آپؐ کو صرف اپنے قبیلے کے لیے ''نذیر'' بنا کر بھیجا گیا ہے اور یہ کہ اسلام صرف مکہ کے لوگوں کے لیے ہے۔ لیکن اب آپؐ بہت آگے، بہت دور اہل کتاب کی طرف دیکھنے لگے جن پر اس سے پہلے آسمانی صحیفے نازل ہو چکے تھے۔ اس یقین کے باوجود آپؐ کو ابھی تک مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اگر کافروں کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپؐ طائف کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس سے آپؐ کی پوزیشن مزید خطرناک ہو جاتی۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے تین قبائلی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ ان میں سے دو سرداروں نے انکار کر دیا البتہ نوفل قبیلے کے سربراہ مطعم نے، جو بائیکاٹ ختم کرانے کی تحریک شروع کرنے والوں میں شامل تھا، یہ وعدہ کیا کہ وہ حضورؐ کی حفاظت کرے گا۔ اس طرح مکہ شہر میں رسول کریمؐ کا داخلہ ممکن ہوا۔

لیکن یہ کوئی طویل المیعاد حل نہیں تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہر قیمت پر قریش کی حمایت حاصل کرنا تھی۔ ۶۱۹ عیسوی میں حضورؐ نے تجارتی میلوں میں شرکت کرنے والے ان زائرین اور تاجروں میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی جو بعد میں بیت اللہ کا حج کرتے تھے۔ آپؐ کو توقع تھی کہ ابوبکرؓ کی طرح غالباً آپؐ کو بھی کسی بدوی قبیلے کا تحفظ حاصل ہو جائے گا اور اگر قریش کی اسٹیبلشمنٹ نے یہ دیکھ لیا کہ بدو اتحادی آپؐ کا احترام کر رہے ہیں تو وہ بھی آپؐ کے ساتھ مصالحت کر لیں گے۔ لیکن آپؐ کے ساتھ خانہ بدوشوں کا رویہ

Marfat.com

جارحانہ اور توہین آمیز رہا۔ اب حضورؐ نے یہ محسوس کر لیا کہ آپؐ کے اپنے وسائل ختم ہو چکے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے صدمے سے آپؐ ابھی تک نڈھال تھے، مکہ میں آپؐ کی پوزیشن نہایت مخدوش تھی اور سات سال کی تبلیغ کے بعد بھی اسلام کے فروغ میں کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اپنے کیریئر کے صبر آزما برسوں میں یہ سب سے مایوس کن صورت حال تھی۔ یہ دل شکستگی کا دور تھا لیکن خدا نے اسی سال آپؐ کو زندگی کے سب سے بڑے روحانی تجربے کا موقع بہم پہنچایا۔

حضورؐ اپنی ایک چچازاد بہن کے پاس جایا کرتے تھے جو حرم کے قریب رہتی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے خانہ کعبہ کے نزدیک عبادت کے لیے، جو آپؐ کا محبوب طریق کار تھا، رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر حضورؐ حرم کے شمال مغربی حصے میں، جہاں حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے مزار تھے، کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ اس کے بعد جبرئیلؑ نے آپؐ کو جگایا اور راتوں رات معجزانہ طور پر آپؐ کو بیت المقدس لے جایا گیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کا متبرک شہر تھا۔ اس مشاہدے کا اظہار قرآن پاک کی اس آیہ مبارکہ میں بالواسطہ پیرائے میں کیا گیا ہے:

پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرم سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۱)۔

قرآن حکیم میں بیت المقدس کا نام نہیں لیا گیا لیکن بعد کی روایات میں ''مسجد اقصیٰ'' کو یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس شہر سے منسوب کیا گیا ہے۔ مورخ طبری کے مطابق نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ کو بتایا کہ جبرئیلؑ نے بعد میں پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ، دوسرے پر عیسیٰؑ اور یحییٰؑ، تیسرے پر یوسفؑ، چوتھے پر ادریسؑ، پانچویں پر ہارونؑ، چھٹے پر موسیٰؑ اور ساتویں آسمان پر ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضورؐ کی ملاقات کرائی۔ (محمد ابن جریر الطبری: تاریخ رسول والملوک صفحہ ۲۲۱۰)۔ قرآن کریم میں بیری کے درخت سدرۃ المنتہیٰ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو انسانی فہم وادراک کی آخری حد ہے:

یقیناً اس نے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا
سدرۃ المنتہیٰ کے پاس
اس کے پاس جنت الماویٰ ہے
جب کہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی
نہ تو نگاہ بہکی، نہ حد سے بڑھی

Marfat.com

یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں (سورہ النجم آیات ۱۳ تا ۱۸)

قرآن مجید نے ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے خدا کی بعض نشانیوں کو دیکھا تھا۔ بعد میں آنے والے صوفیائے عظام نے خالق کائنات سے حضورؐ کی ملاقات کے ضمن میں متضاد رائیں ظاہر کی ہیں۔

مسلمانوں نے اسرا اور معراج کے واقعے میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے کئی اضافی حوالوں کو شامل کیا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معراج، جیسا کہ کئی مسلمان مصنفوں نے لکھا ہے، دوسری سے دسویں صدی تک پروان چڑھنے والی یہودی روایات سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ اسرا کے واقعے کا تذکرہ سب سے پہلے رسول پاکؐ کے آٹھویں صدی کے سیرت نگار محمد ابن اسحاق نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے طویل بیان میں لکھا ہے کہ معراج کی رات جبرئیلؑ نے حضورؐ کو جگایا اور ایک براق پر آپؐ کو سوار کیا۔ رات کے اس سفر (اسرا) کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جبرئیلؑ بیت المقدس پہنچے جہاں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور ماضی کے تمام بڑے پیغمبر آپؐ کا استقبال کرنے کے لیے جمع تھے۔ انہوں نے آپؐ کو وعظ ونصیحت کرنے کی دعوت دی۔ آپؐ نے مسجد اقصیٰ میں تمام انبیا کی امامت کی اور انہیں نماز پڑھائی۔ اس کے بعد تمام رسولوں نے مل کر دعا کی۔

بیشتر مصنفین نے ذات باری تعالیٰ سے ملاقات کا نہایت تقدس آمیز لہجے میں مبہم تذکرہ کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مشاہدہ حقیقی معنوں میں ناقابل بیان ہے اور انسانی فہم وادراک سے پرے اس تجربے کو بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں۔ رسول اللہؐ نے سدرۃ المنتہیٰ سے آگے جا کر، جو انسانی علم اور شعور کی آخری حد ہے، عمومی انسانی نظریات اور تجربات کو پس پشت ڈال دیا۔ اس سفر کے آخری مرحلے میں جبرئیلؑ بھی حضورؐ کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس پرواز کے دوران آں حضرتؐ نے معمول کے حواس، منطق اور استدلال، غرض ہر چیز کو چھوڑ دیا اور آپؐ تجربے کی ایک نئی اقلیم میں داخل ہو گئے۔ صوفیائے متاخرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آپؐ نے اس مشاہدے میں خود اپنا وجود بھی کھو دیا تھا۔ اسرا اور معراج کا واقعہ صرف ایک مرتبہ ظہور پذیر ہوا لیکن اصل میں یہ عمل ہر وقت جاری وساری رہتا ہے۔ یہ واقعہ جو اسلام کی کاملیت کا مظہر ہے، مسلمانوں کو ہر لمحہ خدا کی کامل اطاعت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ یہ خدائے برتر کی ہستی مطلق کی طرف مراجعت کا اقرار ہے۔ معراج کو مسلمانوں کی روحانی زندگی میں ایک روشن وتاباں مثال کا درجہ حاصل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو ہر قسم کی عصبیت، تعصب اور خودنمائی کے تمام حدود کو پار کر کے صراط مستقیم پر گامزن ہونا چاہیے۔

قرآن کریم میں خدا سے ملاقات کے متعلق کوئی آیت موجود نہیں۔ آں حضرتؐ کے لیے یہ ایک ذاتی

Marfat.com

تجربہ تھا۔ ابتدائی سیرت نگاروں نے اس واقعے کو حیرت انگیز تبصروں اور مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسے حضورؐ کی زندگی کا نقطہ عروج قرار دیا ہے۔ آخر حالات نے رسول اللہؐ کو مکہ اور ہر اس چیز کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا جو آپؐ کو بہت عزیز تھی۔ آپؐ کو توقعات کے برعکس اپنی سکونت تبدیل کرنا پڑی اور اپنے زمانے کے مروجہ نظریات سے انحراف کرنا پڑا۔ عربی کی روایتی غنائیہ شاعری میں مطرب اپنی نظم کا آغاز بچھڑی ہوئی محبوبہ کے ذکر سے کرتا ہے جو اپنے قبیلے کے ہمراہ سفر کرتے کرتے اس سے بہت دور چلی گئی ہے۔ اس سے اگلے حصے میں مغنی اپنی محبوبہ کی تلاش میں وطن کو خیر باد کہہ کر رات کو اونٹ پر سوار ہو جاتا ہے اور بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا سفر شروع کر دیتا ہے۔ یہ ایک پر خطر اور دشوار گزار سفر ہے جس میں ہر لمحہ جان ہارنے کا خطرہ ہے۔ آخر شاعر اپنے قبیلے سے جا ملتا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں مطرب اپنے قبیلے والوں کی جرأت مندانہ اقدار، لڑائی میں ان کی جواں مردی اور اپنی بقا کے لیے خطرہ ثابت ہونے والے تمام اجنبی لوگوں کے خلاف مسلسل جنگ کرنے کا فخریہ انداز میں تذکرہ کرتا ہے۔ (Michael Sells: Approaching the Quran, pp17-18)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شب اسریٰ میں ''مروہ'' کی پرانی اقدار الٹ ثابت ہوگئیں۔ اس میں حضورؐ اپنے قبیلے کی طرف لوٹنے کے بجائے دور افتادہ مقام بیت المقدس چلے جاتے ہیں، جاہلیت کی متکبرانہ شجاعت اور جنگجوئی کا مظاہرہ کر کے قبائلی تشخص کو ابھارنے کے بجائے شعور ذات اور انا کو خدا کی رضا اور کامل اطاعت میں مدغم کر دیتے ہیں اور جنگ و جدال پر مسرور ہونے کے بجائے حسن ترتیب و ہم آہنگی اور باقی انسانیت کے ساتھ یک جہتی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

معراج کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجاز کے عربوں کو، جو یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں خدائی پلان سے باہر رکھا گیا ہے، خدا کی وحدانیت کے خاندان میں نمایاں مقام دلانے کے دلی آرزومند تھے۔ بہ ہر حال یہ کثرت وجود کا قصہ ہے۔ حضورؐ نے مکہ کے کثرت وجود کے مشرکانہ نظریے کو اس لیے ترک کر دیا تھا کیونکہ اس سے تباہ کن غرور اور دور جاہلیت کے تشدد کو فروغ ملا تھا۔ اب آپؐ نے وحدانیت میں کثرت وجود کا نظریہ قبول کر لیا تھا۔ بیت المقدس میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ خدا نے تمام قوموں کے لیے جتنے بھی پیغمبر بھیجے، وہ آپس میں ''بھائی'' ہیں۔ آں حضرتؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام پیغمبر آپؐ کو نبوت کا جھوٹا مدعی نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے خوش دلی سے ایک ہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ یہ تمام پیغمبر ایک دوسرے کو برا بھلا نہیں کہتے تھے، نہ ہی انہوں نے دوسرے انبیا کے عقائد کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس انہوں نے ایک دوسرے کی روحانی بصیرت سے استفادہ کیا۔ انہوں نے نئے پیغمبر (نبی کریمؐ) کو بھی وعظ و نصیحت کرنے کی دعوت دی۔ واقعہ معراج سے متعلق ایک روایت کی رو سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت موسیٰؑ سے یہ مشورہ کیا کہ مسلمانوں کے

Marfat.com

لیے دن میں کتنی نمازیں مقرر ہونی چاہییں ۔اصل میں خدا نے مسلمانوں پر روزانہ پچاس نمازیں فرض کی تھیں لیکن موسیٰ علیہ السلام اس تعداد کو کم کرانے کے لیے رسول کریمؐ کو بار بار خدا کے پاس واپس بھیجتے رہے یہاں تک کہ نمازوں کی تعداد گھٹ کر پانچ رہ گئی۔(حضرت موسیٰؑ سمجھتے تھے کہ یہ تعداد اب بھی زیادہ ہے)۔(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۷۲: The Life of Muhammad)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے مذاہب کی تحسین کرنے کو مسلمانوں کی روحانی زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کثرت مذاہب کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔

قرآن حکیم نے شروع میں اس مشترکہ بصیرت پر مسلسل زور دیا ہے۔ایک آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں اور ان پر نازل ہونے والی وحی پر بلا امتیاز ایمان لانا چاہیے۔

آپؐ کہہ دیجیے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد پر اتارا گیا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیا (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے، ان سب پر ایمان لائے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔سورہ آل عمران آیت ۸۴۔

اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیا (علیہم السلام) دیے گئے۔ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔سورہ البقرہ آیت ۱۳۶۔مترجم۔

جب تک آپ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان نہیں لاتے، آپ مسلمان نہیں ہو سکتے۔ سچے دین کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کسی مسلمہ مذہب کے سامنے نہیں، خدا کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک مذہب کے ساتھ خصوصی وفاداری اس شرک کا باعث بن سکتی ہے جس کے ذریعے کسی انسانی ادارے کو خدا کے برابر مرتبہ دے دیا جاتا ہے۔قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں ''اسلام اور مسلمان'' کے لفظوں پر زور دیا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ فعل ''اسلما'' سے مستشق ہیں جس کا مطلب ہے کسی دوسرے کی مرضی اور منشا کے سامنے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دینا۔

جو شخص (اللہ کی کامل اطاعت) اسلام کے سوا اور دین اختیار کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔(سورہ آل عمران آیت ۸۵)۔

Marfat.com

اس آیہ کریمہ کا عام طور پر یہ ''ثابت کرنے'' کے لیے حوالہ دیا جاتا ہے کہ قرآن کے مطابق اسلام واحد سچا دین ہے اور یہ کہ صرف مسلمان ہی نجات پائیں گے۔ لیکن اس وقت تک ''اسلام'' کو رسول کریمؐ کے دین کا باضابطہ نام نہیں دیا گیا تھا اور جب کثرت ادیان کے حوالے سے اس آیت کی تلاوت کی جائے تو اس سے بالکل الٹ مطلب اخذ ہوتا ہے۔

قرآن کریم سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ایک نبی وحی خداوندی کو دوسرے نبی کے سپرد کرتا رہا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کا پیغام حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ سے حضرت موسیٰؑ اور پھر دوسرے پیغمبروں تک مسلسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ قرآن مجید پہلے آنے والی کتابوں تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ (ان کے بیان میں عقل والوں کے لیے یقیناً نصیحت اور عبرت ہے، یہ قرآن جھوٹ بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ یہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے کی ہیں، کھول کھول کر بیان کرنے والا ہے ہر چیز کو اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ سورہ یوسف آیت ۱۱۱۔ مترجم)۔ قرآن حکیم اصل میں خدائی انکشافات کا مجموعہ اور ذات خداوندی کے کلام کا تسلسل ہے۔ (مسلمان، یہودی، ستارہ پرست اور نصرانی کوئی بھی ہو، جو بھی اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، وہ محض بے خوف رہے گا اور بالکل بے غم ہو جائے گا۔ سورہ المائدہ آیت ۶۹)۔ پیغمبر اسلامؐ نے کبھی کسی شخص کو ملت اسلامیہ میں شامل ہونے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ جس مذہب کی بنیاد وحی پر رکھی گئی، اس کا دین، طریق کار اور بصیرت جدا جدا تھی۔ خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بتایا: ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے۔'' اور اگر خدا کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کی چاہت ہے کہ جو تمہیں دیا ہے، اس میں تمہیں آزمائے، تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو، تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ہر وہ چیز بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ (سورہ المائدہ آیت ۴۸۔ مترجم)۔

خدا کسی ایک ملت اور دین کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی ذات تمام انسانی علوم کا سرچشمہ ہے: ''اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔'' خدا نے قرآن کریم کی ایک نہایت فصیح و بلیغ آیت میں یہ اشارہ دیا ہے۔ خدا کے نور کو کسی ایک چراغ تک محدود نہیں رکھا جا سکتا بلکہ ہر کوئی اس نور سے استفادہ کر رہا ہے۔

اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو، وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل سے جلایا جاتا ہو، جو درخت نہ مغربی ہے نہ مشرقی۔ خود وہ تیل قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے اگرچہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے۔ (سورہ النور آیت ۳۵۔ مترجم)۔

Marfat.com

زیتون کا درخت نزول وحی کے تسلسل کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جس کی اصل جڑ تو ایک ہے لیکن اس کی بے شمار شاخوں سے مذہبی مشاہدے کے کئی سوتے پھوٹتے ہیں۔ انہیں کسی ایک مذہب یا علاقے تک محدود نہیں رکھا جا سکتا، نہ ہی اسے مشرق یا مغرب کے خانوں میں قید کیا جا سکتا ہے۔

مکہ میں رسول اللہؐ کی پوزیشن بدستور خطرناک حد تک غیر محفوظ رہی۔ ۶۲۰ عیسوی کے حج کے موسم میں آپؐ اس امید کے ساتھ منیٰ کی وادی میں عازمین کے ایک سے دوسرے خیمے میں جاتے رہے کہ آپؐ ان لوگوں کی حمایت اور محافظت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس مرتبہ آپؐ نے یثرب سے آنے والے چھ عربوں کے ایک گروپ سے ملاقات کی جو عقبہ کی گھاٹی میں قیام پذیر تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معمول کے مطابق ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن کریم کی تلاوت کی۔ لیکن اس دفعہ حضورؐ نے یہ محسوس کیا کہ ان عازمین نے آپؐ کی باتوں کو پوری توجہ سے سنا ہے چنانچہ ان کے دلوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ آں حضرتؐ نے اپنی گفتگو ختم کی تو ان لوگوں نے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ یقیناً وہی پیغمبر ہیں جن کے ظہور کے بارے میں ان کے یہودی اور حنیف ہمسائے پیش گوئی کرتے رہے ہیں۔ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واقعی خدا کے پیغمبر ہیں تو آپؐ یثرب کے بظاہر پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو ضرور حل کر لیں گے۔

یثرب مکہ کی طرح شہر نہیں تھا بلکہ وہاں کئی بستیوں کا ایک سلسلہ آباد تھا جن میں مختلف قبائلی گروپ رہائش پذیر تھے۔ ہر بستی کے گرد اگرد ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔

(Martin Lings: Muhammad, His Life Based on the Earliest Sources:W.Montgomery Watt: Muhammad at Mecca: Watt: Muhammad at Medina)

یثرب کوئی بیس مربع میل رقبے پر محیط ایک زرخیز نخلستان میں واقع تھا جس کے چاروں طرف آتش فشاں سنگلاخ چٹانیں اور اس کی زمین پتھریلی تھی۔ وہاں کے بعض لوگ تجارت کرتے تھے لیکن بیشتر آبادی کھیتی باڑی کرتی۔ ان لوگوں کی گذر اوقات کھجور کے باغوں اور قابل کاشت کھیتوں پر تھی۔ قریش کے برعکس یثرب کے باشندوں کا دارومدار صرف تجارت پر ہی نہیں تھا۔ انہوں نے خانہ بدوشی کی بیشتر قدیم روایات کو ابھی تک برقرار رکھا تھا جس میں بدقسمتی سے دوسرے قبیلوں کے خلاف جارحیت کا پرانا جذبہ بھی شامل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا نخلستان لامتناہی جنگوں کے طویل سلسلے کی لپیٹ میں آ گیا۔ یثرب کے اصل کاشتکار وہ یہودی آبادکار تھے جو چھٹی صدی میں نقل مکانی کر کے یہاں آن بسے تھے۔ اس وقت یثرب میں تقریباً بیس یہودی قبیلے موجود تھے جن میں یہودیت میں ضم ہونے والے کئی عرب باشندے بھی شامل تھے۔

(Reza Aslan: No god but God: A History of Jews in Arabia)

Marfat.com

ان یہودیوں نے اپنا علیحدہ مذہبی تشخص برقرار رکھا البتہ دوسرے معاملوں میں انہیں ہمسایہ مشرکوں سے ممیز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خاندان اور قبیلے سے وفاداری کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی البتہ کسی متحدہ ''یہودی برادری'' کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہودی قبیلوں نے تمام عرب گروپوں کے ساتھ الگ الگ اتحاد قائم کر رکھا تھا اور وہ اکثر ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔ کھجور کی فصل نے انہیں امیر بنا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سونے چاندی کے زیورات اور ہتھیار بنانے کے ماہر اور ہنرمند دستکار بھی تھے۔ یہودیوں کے چار بڑے قبیلوں کے نام یہ ہیں: ثعلبہ، قریظہ، نضیر اور قینقاع۔ ان میں آخر الذکر قبیلے کو یثرب کی واحد منڈی پر کنٹرول اور معیشت پر مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔

لیکن چھٹی صدی میں بنی قیلہ جنوبی عرب سے نقل مکانی کر کے دوسرے یہودیوں کے قریب نخلستان میں آباد ہو گئے۔ یہ نو وارد بعد میں اوس اور خزرج قبیلوں میں بٹ گئے اور ان دونوں قبیلوں کا الگ الگ تشخص قائم ہو گیا۔ ان عربوں نے بتدریج اپنی زمینیں حاصل کر لیں، اپنے قلعے تعمیر کر لیے اور ساتویں صدی شروع ہونے تک ان کی پوزیشن یہودیوں کے مقابلے میں قدرے مضبوط ہو گئی۔ لیکن وسائل پر ناگزیر مسابقت کے باوجود یہودی اور مشرک ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہتے تھے۔ یہودی اپنی کھجوروں کی نقل و حمل کے لیے عربوں کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے اور عرب یہودیوں کی فنی مہارت، کاریگری اور مذہبی ورثے کا احترام کرتے: ''یہودی اپنے حسب نسب اور خصوصیات کے اعتبار سے نمایاں تھے جب کہ ہم لوگ محض ایک عرب قبیلہ تھے جن کے پاس کھجوروں اور انگوروں کے باغ نہیں تھے۔ ہمارے پاس صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے۔'' (محمد ابن عمر الواقدی: کتاب المغازی: Aslan: No god but God, p.54)۔

لیکن ۶۲۰ عیسوی میں جب یثرب کے چھ عازمین نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کی، اس وقت صورت حال انتہائی مخدوش ہو چکی تھی۔ پرانی قبائلی دشمنی کھل کر سامنے آ گئی تھی اور اوس اور خزرج خونیں تنازعے میں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے تھے۔ یہود کے قبیلے بھی اس کشمکش میں ملوث تھے۔ بنی نضیر اور قریظہ اوس جب کہ قینقاع قبیلہ خزرج کا اتحادی تھا۔ ۶۱۷ عیسوی تک دونوں فریق زچ ہو گئے اور کوئی بھی فریق دوسرے پر غلبہ حاصل نہ کر سکا۔ لڑائی کی وجہ سے ہر شخص نڈھال ہو چکا تھا۔ خزرج قبیلے کا سردار عبداللہ ابن ابی ایک لڑائی (جنگ بعاث۔ مترجم) میں سب سے الگ تھلگ رہا جس کے بعد اسے ایک غیر جانبدار لیڈر کی حیثیت سے شہرت مل گئی۔ چنانچہ کئی لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ ممکنہ بادشاہ یا تمام قبیلوں کا سردار بن کر یثرب میں امن و امان بحال کر دے گا۔ لیکن بادشاہت عربوں کے مزاج کے منافی تھی اور جزیرہ نما میں اس سے پہلے اس قسم کا انتظام کبھی کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اوس کا قبیلہ اپنی قیادت کو خزرجی سردار کے حوالے کرنے میں فطری طور پر

Marfat.com

متذبذب تھا۔قبیلہ خزرج کے دوسرے سردار بھی اپنا اقتدار ابن ابی کے حوالے کرنے پر رضامند نہیں تھے۔

یثرب کے چھ زائرین نے فوری طور پر یہ محسوس کرلیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے ترجمان کی حیثیت سے عبداللہ ابن ابی کے مقابلے میں زیادہ موثر ثالث (حکم) ثابت ہوں گے۔حضورؐ کے پیغام کی وجہ سے انہیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا کیونکہ یثرب کے عرب کچھ عرصے سے وحدانیت کے نظریے کی طرف راغب ہونا شروع ہوگئے تھے۔اوس اور خزرج خود کو یہودیوں کی نسبت کم تر سمجھتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس کوئی آسمانی صحیفہ موجود نہیں تھا۔یثرب کے عازمین نے جب یہ سنا کہ خدا نے آخرکار عربوں کی طرف اپنا پیغمبر بھیج دیا ہے تو یہ بات ان کے دل میں اتر گئی۔انہوں نے فوراً خدا کی کامل اطاعت کرنے کا عہد کیا اور کہنے لگے:

''ہم نے اپنی قوم کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ عداوت اور فتنہ جس قدر ان میں ہے، کسی اور قوم میں نہیں۔شاید آپؐ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان میں اتحاد پیدا کردے۔ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپؐ کے معاملہ (نبوت) کی جانب انہیں بھی مدعو کریں گے، انہیں بھی آپؐ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کرلیا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپؐ کے متعلق متفق کردیا تو کوئی عرب آپؐ سے زیادہ طاقتور نہ ہوگا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۸۷:The Life of Muhammad, p.198)۔ لیکن ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ نخلستان میں ان کا اثر ورسوخ بہت کم ہے لہٰذا انہیں اپنے سرداروں اور سمجھدار لوگوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ایک موثر حکم بننے کے لیے ضروری تھا کہ آپؐ کو بڑے پیمانے پر لوگوں کی حمایت حاصل ہوتی۔ان زائرین نے حضورؐ سے وعدہ کیا کہ وہ ایک سال کے بعد آپؐ سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔یہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔حالات نے رسول اللہؐ کو مکہ سے آگے بلکہ اپنے قبیلے کو چھوڑ کر کسی اور قبیلے کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرنے کے غیر معمولی نظریے پر عمل کرنے کے امکان پر غور کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

نبی کریمؐ جس وقت یثرب میں پیش رفت کا انتظار کررہے تھے تو اسی دوران آپؐ نے خانگی معاملات میں بعض تبدیلیاں کردیں۔آپؐ کو ایک بیوی کی ضرورت تھی چنانچہ یہ تجویز کیا گیا کہ آپؐ کو بنی عامر کے مشرک سردار سہیل کی چچازاد بہن اور خواہر نسبتی حضرت سودہؓ کے ساتھ شادی کرلینی چاہیے۔ان کی شادی ۶۱۶ عیسوی میں ہجرت کرکے حبشہ جانے والے ایک مسلمان کے ساتھ ہوئی تھی لیکن اب وہ بیوہ تھیں اور حضورؐ سے شادی ان کے لیے نہایت موزوں تھی۔حضرت ابوبکرؓ بھی آں حضرتؐ کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہاں تھے لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ ان کی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کی شادی رسول اللہؐ سے ہونی چاہیے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت چھ سال تھی۔حضورؐ کے ساتھ ان کی باضابطہ منگنی کے موقعے پر ایک تقریب منعقد

Marfat.com

ہوئی جس میں حضرت عائشہؓ موجود نہیں تھیں۔ بعد میں وہ بتایا کرتی تھیں کہ انہیں اپنی نئی حیثیت کا اشارہ اس وقت ملا جب ان کی والدہ نے انہیں بتایا کہ اب وہ گلیوں میں نہیں کھیل سکتیں بلکہ انہیں اپنی سہیلیوں کو گھر میں بلا لینا چاہیے۔

مغرب میں رسول کریمؐ کے حرم کے بارے میں فحش، فرضی اور من گھڑت قصے وضع کیے گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں، جہاں کثیر الازدواجی عام تھی، حضرت خدیجہؓ ہی حضورؐ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک رہیں اور ان کی موجودگی میں آپؐ نے کوئی اور شادی نہ کی۔ آں حضرتؐ کی شادیاں کسی رومان یا محبت کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھیں بلکہ یہ شادیاں عملی ضرورتیات کے تحت عمل میں آئی تھیں۔ حضرت سودہؓ ایک گھریلو خاتون تھیں اور عمر کی تیسری دہائی گزار رہی تھیں۔ وہ رسول کریمؐ کے گھر کو سنبھال سکتی تھیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ بھی امید تھی کہ سہیل اسلام قبول کر لے گا، اس نے اسلام کے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کی منگنی میں بھی غیر معقولیت کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اس زمانے میں کسی اتحاد پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے بالغ مردوں کی حضرت عائشہؓ سے بھی کم عمر لڑکیوں کے ساتھ ان کی غیر حاضری میں شادی کر دی جاتی تھی۔ یورپ میں جدید دور سے پہلے اس روایت پر عمل جاری رہا۔ حضرت عائشہؓ دوسری لڑکیوں کی طرح جب تک بلوغت کی عمر تک نہ پہنچتیں، اس وقت تک شادی کی تکمیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کی شادیاں عام طور پر سیاسی مقاصد کے تحت ہوئیں۔ آپؐ نے خونی رشتوں کے بجائے نظریے کی بنیاد پر ہر اعتبار سے ایک نئی قسم کا قبیلہ تشکیل دینا شروع کر دیا تھا تاہم خون کے رشتوں کو اب بھی ایک مقدس درجہ حاصل تھا جس سے تجرباتی طور پر قائم کی جانے والی اس برادری میں یک جہتی کو مضبوط کرنے میں نمایاں مدد مل سکتی تھی۔

۶۲۱ عیسوی کے حج کے دوران یثرب کے وہ چھ افراد، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وعدے کے مطابق مکہ پہنچ گئے بلکہ وہ کئی اور لوگوں کو بھی ساتھ لے آئے۔ انہوں نے عقبہ کی گھاٹی میں حضورؐ سے دوبارہ ملاقات کی۔ اس ملاقات میں، جو بعد میں پہلی بیعت عقبہ کے نام سے موسوم ہوئی، انہوں نے اس بات پر بیعت کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، نہ چوری کریں گے، نہ زنا کے مرتکب ہوں گے، نہ ہی اپنی اولاد کو قتل کریں گے، نہ جان بوجھ کر کسی پر جھوٹا الزام لگائیں گے اور نہ ہی کسی اچھی بات میں حضورؐ کے حکم کے خلاف جائیں گے۔ رسول اللہؐ نے اس کے جواب میں ان مسلمانوں سے جنت کا وعدہ کیا۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۸۹: The Life of Muhammad, p.199)۔ اس پہلی بیعت میں دین اور اخلاقیات پر زور دیا گیا اور کوئی سیاسی وعدہ نہ کیا گیا۔ جب یہ مسلمان یثرب لوٹے تو وہ ایک قابل اعتماد مسلمان مصعبؓ ابن عمیر کو اپنے ساتھ لے گئے تا کہ وہ ان لوگوں کو قرآن پڑھائیں، انہیں اسلام کی تعلیم دیں اور نئے دین

Marfat.com

کی سمجھ پیدا کریں۔

یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ اس وقت یثرب میں قبائلی نفرت اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ نہ تو اوس اور نہ ہی خزرج قبیلے کا کوئی شخص نماز میں ایک دوسرے قبیلے کا امام بننے یا اس سے قرآن سننے کو تیار تھا۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے باہر کے کسی غیر جانب دار شخص کا تقرر کیا جائے۔ اسلام کے بارے میں اوس قبیلے کے لوگوں کا رویہ شروع میں نہایت جارحانہ تھا لیکن ان کے اسلام دشمنی کے جذبات قرآن کریم کی طاقت کے سامنے ماند پڑ گئے۔ ایک دن اوس کے ایک نامور قبیلے کا سردار سعد بن معاذ یہ سن کر غضبناک ہو گیا کہ مصعبؓ اس کے علاقے میں ایک باغ میں بیٹھ کر اس کے قبیلے والوں کو اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے نائب اسید سے کہا کہ وہ مصعبؓ کو اس کے علاقے سے نکال دے۔ اسید نے اپنی برچھی پکڑی اور جب اس نے چند لوگوں کو حلقہ بنائے مصعبؓ کے اردگرد بیٹھے دیکھا تو وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ اس نے مصعبؓ سے کہا کہ تم ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بنانے کے لیے ہمارے پاس کیوں آئے ہو؟ حضرت مصعبؓ نے دور جاہلیت کی طرح کوئی جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اسید سے کہا کہ وہ بیٹھ کر ان کی تعلیمات کا خود جائزہ لے۔ چنانچہ اسید نے اپنی برچھی زمین میں گاڑ دی اور ان کے پاس بیٹھ کر قرآن سننے لگا۔ ''یہ چیز تو بہت ہی خوب اور بہترین ہے!'' قرآن سن کر اسید کہنے لگا: ''جب تم کسی کو اپنے دین میں داخل کرنا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟'' جب اس نے غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہن لیے تو کلمہ توحید پڑھا اور دو رکعت نماز ادا کر لی۔ اس کے بعد اسید اپنے سردار کو رپورٹ دینے واپس چلا گیا۔ واقعے کی تفصیل سن کر سعد سخت مشتعل ہو گیا اور خود برچھی پکڑ کر مصعبؓ کے پاس چلا گیا۔ لیکن جب اس نے قرآن سنا تو اسید کی طرح وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ وہ بھی اسلام قبول کر لیں اور اس کی قیادت پر بھروسا کریں۔ چنانچہ ان کا پورا قبیلہ اجتماعی طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحات ۲۹۱، ۲۹۲: The Life of Muhammad, pp.200-201)۔ حضرت سعدؓ کے قبول اسلام کی خبر سن کر دوسرے سردار بھی بہت متاثر ہوئے اور وہ حضرت مصعبؓ کی باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے سننے لگے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نخلستان کے ہر گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد مسلمان ہو گیا۔ مکہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تبلیغی مشن اس لیے جمود کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ قریش کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک عام آدمی خدا کا پیغمبر بن سکتا ہے۔ لیکن یثرب کے حالات مکہ سے بالکل مختلف تھے۔

(Bamyeh: Social Origins of Islam, p.153)۔

رسول اللہؐ اب ایک عام شخص نہیں رہے تھے جو دوسرے لوگوں کی طرح بازار میں گھومتے پھرتے اور

Marfat.com

کھاتے پیتے بلکہ اب آپؐ کو ایک دور افتادہ پراسرار شخصیت کی حیثیت حاصل ہوگئی جن کا یثرب میں نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ مکہ میں آپؐ کی تعلیمات سے حرم کے مروجہ مذہب کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا جس کے نتیجے میں معیشت کو سخت نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس کے برعکس یثرب میں ایسا کوئی معبد موجود نہیں تھا جس میں بتوں کی بھرمار ہو۔ لیکن یثرب کے سب لوگ نئے دین کے گرویدہ نہیں تھے۔ ابن ابی کو فطری طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اسلام کی وجہ سے اس کی پوزیشن کمزور ہو رہی ہے۔ کئی لوگ اب بھی پرانے مشرکانہ عقائد یا دین حنیفیہ پر کاربند تھے لیکن اس مرحلے پر اسلام دشمن زبانیں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئیں۔ اگر نیا پیغمبر یثرب کے مسئلوں کو حل کر دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں نخلستان کے باشندوں کو مالی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہود کے قبائل بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شک کا فائدہ دینے کو تیار تھے۔ اس کی خصوصی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہود کے پیغمبروں کا احترام کرتے تھے اور انہوں نے یہودیوں کی بعض روایات کو بھی اپنا لیا تھا۔

اس دوران رسول کریمؐ نے بعض نئی عبادات متعارف کرائیں۔ شب اسرا کے بعد مسلمان اہل کتاب کے مقدس شہر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ حضورؐ نے حضرت مصعبؓ کو جمعے کی سہ پہر کو، جب یہودی یوم سبت کی تیاری کر رہے ہوں، خصوصی نماز جمعہ ادا کرنے کی بھی ہدایت کی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہود کے یوم کفارہ پر روزہ رکھنے کا بھی حکم دے دیا گیا۔ اب مسلمان یہودیوں کی طرح دوپہر کو بھی نماز پڑھنے لگے نیز یہودیوں کے کھانے پینے کے ان قوانین پر اصلاح شدہ صورت میں عمل درآمد شروع کر دیا گیا جن پر ابتدائی عیسائی کاربند تھے۔ (کل پاکیزہ چیزیں آج تمہارے لیے حلال کی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے، اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں ان کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں جب کہ تم ان کے مہر ادا کرو، اس طرح کہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کرو یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو، منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں اور آخرت میں وہ ہارنے والوں میں سے ہیں۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو، اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو، ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی حاجت ضروری سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کر لو، اسے اپنے چہروں پر اور ہاتھوں پر مل لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا اور تمہیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے تا کہ تم شکر ادا کرتے رہو۔ تم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں نازل ہوئی ہیں انہیں یاد رکھو اور اس کے عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ ہوا ہے جب کہ تم نے کہا ہم نے سنا اور مانا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو،

Marfat.com

یقیناً اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔سورہ المائدہ آیات ۵ تا ۷۔مترجم)۔اس سے پہلے اسکالرز یہ سمجھتے رہے ہیں کہ نبی کریمؐ نے زہد وریاضت کے نئے دستور یثرب کے یہودیوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے نافذ کیے تھے لیکن حال ہی میں اس نظریے کو چیلنج کر دیا گیا ہے۔آں حضرتؐ کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہودی اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس الہامی کلام موجود تھا۔خدا نے ہر قوم کے لیے اپنا پیغمبر بھیج رکھا تھا۔(اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے سو جب ان کے پاس خدا کا رسول آ چکتا ہے ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔سورہ یونس آیت ۴۷۔مترجم)۔اصل میں مسلمانوں کے لیے یہ ایک فطری بات تھی کہ وہ دین ابراہیمی کے دوسرے پیروکاروں کی طرح روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے۔

۶۲۲ عیسوی میں زائرین کی ایک بڑی جماعت حج کے لیے یثرب سے مکہ روانہ ہوگئی۔ان میں کئی مشرک بھی شامل تھے تاہم ۷۳ مرد اور دو خواتین مسلمان تھیں۔اس مرتبہ بھی ان زائرین نے عقبہ میں رسول پاکؐ سے ملاقات کی لیکن یہ ملاقات نصف شب کے قریب ہوئی۔زائرین کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ ان کا یہ اقدام پلوں کو مکمل طور پر جلا دینے کے مترادف ہے۔قرآن مجید میں قریش کی ''تدبیروں'' کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت کفار حضورؐ کو خارج از بلد کرنے اور حرم میں مسلمانوں کے داخلے پر پابندی لگانے کی تدبیریں کر رہے تھے:

اور اس واقعے کا بھی ذکر کیجیے جب کہ کافر لوگ آپؐ کی نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپؐ کو قید کرلیں یا آپؐ کو قتل کر ڈالیں یا آپؐ کو خارج وطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے۔(سورہ انفال آیت ۳۰۔مترجم)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب اپنے قبیلے کو چھوڑنے کے لیے خصوصی اقدامات کر رہے تھے۔ محمد ابن اسحاق نے دعویٰ کیا ہے کہ حضورؐ کا ہجرت کرنے کا اقدام ایک مثبت فیصلہ تھا لیکن قرآن حکیم بار بار یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو مکہ سے جبراً نکالا گیا تھا۔(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور (خود) اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، تم تو دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس آ چکا ہے، کفر کرتے ہیں، پیغمبرؐ کو اور خود تمہیں بھی محض اس وجہ سے جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کے لیے اور میری رضامندی کی طلب میں نکلتے ہو (تو ان سے دوستیاں نہ کرو)، تم ان کے پاس محبت کا پیغام پوشیدہ پوشیدہ بھیجتے ہو اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم نے چھپایا اور وہ بھی جو تم نے ظاہر کیا، تم میں سے جو بھی اس کام کو کرے گا وہ یقیناً راہ راست سے بہک جائے گا۔سورہ الممتحنہ آیت ۱۔

Marfat.com

مترجم)۔عقبہ میں ملاقات کوانتہائی خفیہ رکھا گیا۔ یثرب کے مسلمانوں نے اپنی جماعت میں شامل مشرکوں تک سے اس کا ذکر نہ کیا تا کہ وہ قریش کوان کے منصوبے سے آگاہ نہ کردیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کچھ کرنے والے تھے جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

(W. Montgomery, Watt: Muhammad's Mecca, pp 101-106:

Muhammad at Mecca, pp.149-51)

آپؐ مکہ کے مسلمانوں سے بار بار کہہ رہے تھے کہ وہ ہجرت کر کے یثرب چلے جائیں۔اس کا مقصد محض جگہ تبدیل کرنا نہیں تھا۔ مسلمان اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر اجنبی لوگوں کی مستقل حفاظت میں پناہ لینے والے تھے۔عرب میں، جہاں قبیلے کو تمام باتوں پر مقدس درجہ حاصل تھا، قبیلے کو ترک کرنا قرآن کی طرف سے دیویوں کی مذمت کرنے سے کہیں زیادہ المناک فعل تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں شروع سے کنفیڈریشن سسٹم رائج تھا جس کی رو سے ایک فرد یا پورا گروپ کسی دوسرے قبیلے کی اعزازی رکنیت حاصل کر کے اس کی پناہ میں آجاتا تھا لیکن یہ عارضی انتظامات تھے۔خود ہجرہ کا لفظ ایک تکلیف دہ جدائی کی غمازی کرتا ہے۔لفظ ہجر یا ہجرہ کا ترجمہ ہے: ''دوستانہ یا محبت آمیز تعلقات یا روابط کو منقطع کر لینا۔'' (Watt: Muhammad's Mecca, p.251)۔ چنانچہ مکہ سے ہجرت کر کے یثرب جانے والے مسلمانوں کو مہاجرین کے نام سے موسوم کیا گیا۔اپنے شہر کو چھوڑنے کی اس المناک کارروائی کے بعد مسلمانوں کو ایک نیا تشخص مل گیا۔

یثرب کے مسلمان بھی ایک خطرناک تجربے سے گزر رہے تھے۔اگر کوئی قبیلہ کسی اجنبی کو اپنا لیتا تو بھی اس شخص کو ''ظالم'' ہی تصور کیا جاتا۔لفظ ''ظالم'' ہیچ، سفلہ، رذیل اور کم ظرف کی دلالت کرتا ہے۔ (Izutsu: Ethico Religious Concepts, p.561)۔عرب کے شاعر حضرات لفظ ''ظالم'' کو بے کار، نکمے اور زائد از ضرورت شخص کے لیے استعمال کرتے تھے۔ قبیلے سے وفاداری اپنے عزیزوں سے بے پایاں محبت اور اجنبی لوگوں سے شدید نفرت کی متقاضی تھی۔ جو شخص کسی حقیر ظالم کو اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتا، اسے نفرت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑتا۔لیکن اب اوس اور خزرج قریشی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھانے اور اجنبی لوگوں کی بڑی تعداد کو تحفظ اور امداد (نصر) کی فراہمی کا وعدہ کرنے والے تھے جو نخلستان کے محدود وسائل پر بوجھ بن سکتی تھی۔اس کے بعد یثرب کے مسلمان انصار کہلانے لگے۔لفظ ''انصار'' کا مطلب عام طور پر ''مددگار'' کیا جاتا ہے لیکن اس سے اس کے اصل مفہوم کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ ''نصر'' کا مطلب ہے کہ آپ جن لوگوں کو تحفظ اور امداد دے رہے ہیں، ضرورت پڑنے پر اس مقصد کے لیے آپ کو طاقت بھی استعمال کرنا ہوگی۔ چنانچہ ان انصار نے اس رات جب عقبہ میں رسول اللہؐ سے ملاقات

Marfat.com

کی تو وہ حضورؐ کے ساتھ دوسری بیعت کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جسے جنگ کے لیے بیعت کہا جاتا ہے۔

ملاقات کا وقت آیا تو انصار نے اپنے مشرک ساتھیوں کو خیموں میں سونے دیا اور تیتر کی چال دبے پاؤں چلتے ہوئے عقبہ پہنچ گئے جہاں وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے چچا عباس سے ملے جو حضورؐ کے ترجمان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عباس ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور انہیں آں حضرتؐ کا یہ فیصلہ سن کر یقیناً سخت صدمہ پہنچا ہوگا کہ آپؐ مکہ کو چھوڑ رہے ہیں۔ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ آپؐ یثرب میں محفوظ ہوں گے۔ انہوں نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے انصار سے کہا کہ وہ بیعت کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں کہ مدینہ میں وہ رسول اللہؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی قریش سے حفاظت کر سکیں گے یا نہیں؟ اگر انہیں ان لوگوں کی سلامتی کے بارے میں ذرہ بھر بھی شبہ ہے تو انہیں اس منصوبے سے فوری طور پر دست بردار ہو جانا چاہیے۔ لیکن انصار اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ خزرج قبیلے کے ایک سردار حضرت براءؓ ابن معرور نے حضورؐ کا دست مبارک تھام لیا اور کہا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، ہمیں یہ شرطیں قبول ہیں اور ہم ضرور ان چیزوں سے آپؐ کی حفاظت کریں گے جن سے ہم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ واللہ! ہم سپاہی اور مسلح لوگ ہیں۔ جنگ تو ہمیں اپنے بزرگوں کی میراث میں ملی ہے۔'' لیکن براءؓ رسول اللہؐ سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ایک اور انصاری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں اور دوسرے لوگوں یعنی یہود میں خاص قسم کے تعلقات ہیں اور کئی مسلمانوں کی حفاظت کرنے پر یہ تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو غلبہ عطا فرمایا تو کیا ایسا تو نہیں ہوگا کہ آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں؟'' اس پر نبی کریمؐ نے تبسم کرتے ہوئے فرمایا: ''ایسا نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ جس سے تم جنگ کرو گے، میں بھی اس سے برسر پیکار ہوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے، میں بھی اس سے مصالحت کروں گا۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ، صفحہ ۲۹۷:The Life of Muhammad, p.204)۔

چنانچہ انصار نے یہ عہد کیا جو بعد میں عہد جنگ کے نام سے مشہور ہوا: ''ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم تنگ حالی، تونگری، خوشی، مجبوری اور ہر قطعی حکم میں، جو ہمیں دیا جائے، رسول اللہؐ کی مکمل اطاعت کرتے ہوئے جنگ کریں گے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں، حق بات کہیں گے اور اللہ کے احکام کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔''

(تاریخ رسول والملوک صفحہ ۱۲۸۱:W.Montgomery Watt: Muhammad at Medina, p.205)۔

معاہدے میں جو زبان اور انداز اختیار کیا گیا، جدید اصطلاح میں اسے دوطرفہ دفاع کے نام سے موسوم کیا

Marfat.com

جاسکتا ہے۔(Bamyeh: Social Origins of Islam, pp.216-17)۔اس وقت تک ایک متحدہ امت کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔اوس، خزرج اور قریش کا دائرہ عمل الگ الگ ہوگا۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے نہیں، اوس اور خزرج کے درمیان ثالث (حکم) اور مکہ سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے سربراہ کے طور پر یثرب جا رہے تھے۔انصار پر مختلف خاندانوں کے بارہ ''نگران کار'' حکومت کریں گے۔اگرچہ ابتدائی برس کے دوران یثرب میں اسلام کو تیزی کے ساتھ فروغ حاصل نہ ہوا، اس کے باوجود مسلمان برادری مکہ میں محصور زندگی گزارنے کے برعکس پوری طرح مطمئن اور مسرور تھی البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہجرت کے بعد نخلستان میں بھی وہ ایک معمولی اقلیت رہے اور مشرکین، حنیف اور یہودیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ (Aslan: No god but God: pp.56-59)۔ جنگ کرنے کا عہد (بیعت) اسلام کے فروغ میں بے حد معاون ثابت ہوا اور کئی دوسرے قبیلے بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تاہم اسے قبائلی کلچر کا مقام حاصل نہ ہو سکا۔ہجرت ایک خطرناک، ناقابل واپسی اور خوفناک اقدام تھا اور کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہوگا؟

حج کے بعد انصار واپس یثرب آ کر مسلمان تارکین وطن کا انتظار کرنے لگے۔اب قرآن نے یثرب کو آرامی زبان میں مدینہ (شہر) کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا۔اس سے پہلے یہودی بھی یثرب کی بستی کو مدینہ کے نام سے پکارتے تھے۔آخر میں یثرب المدینہ یعنی نبی کریمؐ کا شہر بن گیا۔مکہ میں حضورؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی لیکن آپؐ نے ہجرت کرنے کا حکم نہ دیا۔جو بھی شخص، خواہ وہ مرد تھا یا عورت، ہجرت کرنے کی استطاعت نہ رکھتا، اسے مکہ ہی میں رہنے کی اجازت تھی۔لیکن ۶۲۲ عیسوی کے جولائی اور اگست کے مہینوں میں کوئی ستر مسلمان اپنے خاندانوں کو لے کر مدینہ چلے گئے جہاں وہ اپنے مکان بننے تک انصار کے گھروں میں ٹھہرے رہے۔قریش نے ان لوگوں کو مکہ میں روکنے کی کوئی فیصلہ کن کوشش نہ کی البتہ بعض خواتین اور بچوں کو مدینہ جانے سے جبراً روک لیا گیا اور ایک مسلمان کو اونٹ کے ساتھ باندھ کر فاتحانہ انداز میں واپس مکہ لے جایا گیا۔اس کے بعد مسلمان محتاط ہو گئے اور اکثر شہر سے باہر ملاقات کرتے۔یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں سفر کرنے لگے: ''حضرت عمرؓ اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ چلے گئے اور حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ اور حضورؐ کے خاندان کے دوسرے افراد کو لے کر حضرت زیدؓ اور حضرت حمزہؓ کے ہمراہ ہجرت کر گئے۔لیکن جب تک تمام مسلمان مدینہ نہ چلے گئے، رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ مکہ ہی میں مقیم رہے۔بڑے پیمانے پر ہجرت کے بعد شہر میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ہجرت سے قریش کو بھی آں حضرتؐ کے ہاتھوں سخت گھاؤ لگا۔مکہ کے وسط میں واقع بڑے بڑے مکان کھنڈر بن گئے، راہ گیروں کو یہ مکان دیکھ کر خوف

Marfat.com

آتا، ان خالی مکانوں کے دروازے دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔"

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۱۶: The Life of Muhammad, p.215)۔

پھر اگست میں رسول کریمؐ کے محافظ مطعم کا انتقال ہو گیا اور حضورؐ کی زندگی ایک مرتبہ پھر خطرے میں پڑ گئی۔ اب مکہ میں آں حضرتؐ کی پوزیشن غیر مستحکم ہو گئی اور آپؐ کو کسی بھی وقت قتل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے سردار آپؐ کے متعلق صلاح مشورے کے لیے دارالندوہ میں جمع ہو گئے لیکن ابولہب احتیاطاً اس اجلاس میں شریک نہ ہوا۔ بعض سردار آپؐ کو مکہ سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے البتہ دوسروں نے محسوس کیا کہ آپؐ کا یثرب میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ جا ملنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آخر ابوجہل نے ایک پلان پیش کیا جس پر عمل کرنے سے قبائلی خوں ریزی کے بغیر حضورؐ کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق ہر قبیلے میں سے ایک نوعمر، قوی اور شریف النسب شخص لے لیں، ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار دے دیں۔ یہ سب اس طرح ایک ساتھ رسول اللہؐ پر تلواریں ماریں گویا ایک ہی شخص کا وار ہے۔ اس طرح آپؐ کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے گا اور بنی ہاشم قریش کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے۔

اس پلان کے تحت جلد ہی قریش کے نوجوانوں کے ایک گروہ کا انتخاب کر لیا گیا۔ یہ نوجوان حضورؐ کے دروازے پر جمع ہو گئے لیکن جب انہیں کھڑکی سے حضرت سودہؓ اور حضورؐ کی صاحبزادیوں کی آوازیں سنائی دیں تو وہ پریشان ہو گئے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ ایک شخص کو اس کے گھر کی خواتین کی موجودگی میں قتل کرنا شرمناک فعل ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا یہاں تک کہ رسول خداؐ صبح سویرے گھر سے نکل گئے۔ اس سازش میں شریک ایک شخص نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو حضورؐ چادر اوڑھے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں پتا نہ چلا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکان کی پچھلی کھڑکی سے باہر نکل گئے ہیں۔ آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ اگلی صبح حضرت علیؓ جب حضورؐ کی چادر اوڑھے باہر نکلے تو قریشی نوجوانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ دھوکا کھا گئے ہیں۔ قریش نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص نبی کریمؐ کو مردہ یا زندہ پکڑ کر واپس لائے گا، اسے انعام میں ایک سو اونٹنیاں دی جائیں گی۔

اسی اثنا میں رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ مکہ کے قریب ایک پہاڑ کی غار میں چھپے رہے۔ انہوں نے غار ثور میں تین دن تک قیام کیا۔ اس دوران آپؐ کے پیروکار وقتاً فوقتاً شہر کی خبریں اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر غار میں جاتے۔ روایات کے مطابق ایک مرحلے پر آپؐ کو تلاش کرنے والی جماعت غار کے قریب پہنچ گئی لیکن انہوں نے غار کے اندر جھانک کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مکڑی کے ایک بڑے چھتے نے غار تک جانے

Marfat.com

والے راستے کو ڈھانپ دیا اور ایک خاردار درخت راتوں رات معجزانہ طور پر وہاں پیدا ہو گیا اور ٹھیک اس جگہ پر، جہاں کوئی شخص پاؤں رکھ کر غار میں داخل ہو سکتا تھا، ایک فاختہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان تین دنوں میں نبی کریمؐ نہایت پرسکون رہے اور آپؐ کو پروردگار کی موجودگی کا بھرپور احساس رہا۔ آپؐ ابوبکرؓ کو تسلی دیتے رہے جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے:

اس وقت جب کافروں نے آپؐ کو (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس جناب باری تعالیٰ نے اپنی طرف سے تسکین اس پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں۔ (سورہ التوبہ: آیت ۴۰۔ مترجم)۔ قرآن کریم میں مسلمانوں پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ مسلمان جب خوف زدہ ہوں یا پریشان کن حالات سے دوچار ہوں تو انہیں پرسکون اور مطمئن رہنا چاہیے اور انہیں جاہلیت کے غیظ و غضب، غصے، تندخوئی اور انتقامی جذبے سے مغلوب نہیں ہونا چاہیے۔

جب شور و غوغا ختم ہوا تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ابوبکرؓ غار سے نکل آئے البتہ آپؐ نے یہ خیال رکھا کہ فاختہ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ پھر حضورؐ اور ابوبکرؓ ان دو اونٹنیوں پر سوار ہو گئے جو حضرت ابوبکرؓ نے اس سفر کے لیے خرید کی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ رسول کریمؐ کو بہترین اونٹنی دینا چاہتے تھے لیکن آں حضرتؐ نے اصرار کیا کہ آپؐ اونٹنی کی قیمت ادا کریں گے۔ چونکہ یہ آپؐ کی ذاتی ہجرت اور خدا کے حضور نذرانہ تھا لہٰذا یہ بات اہم تھی کہ آپؐ نے اس پورے واقعے کو مکمل طور پر نجی معاملہ تصور کیا۔ آپؐ نے اس اونٹنی کا نام قصویٰ رکھا اور یہ اونٹنی بقیہ زندگی میں آپؐ کی پسندیدہ سواری رہی۔ یہ ایک خطرناک اور دشوار سفر تھا کیونکہ سڑک پر آں حضرتؐ کو کسی شخص کی رسمی پناہ حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ راستہ دکھانے والے شخص نے ایک پُرپیچ راہ اختیار کی اور آپؐ ٹیڑھے میڑھے راستے پر آگے چلتے گئے تاکہ تعاقب کرنے والا کوئی شخص آپؐ تک پہنچ نہ پائے۔

اسی دوران مدینہ میں مسلمان نہایت بے چینی سے آپؐ کا انتظار کر رہے تھے۔ بیشتر مہاجرین نخلستان کے انتہائی جنوبی علاقے میں رہ رہے تھے۔ وہ ہر روز فجر کی نماز پڑھ کر ایک پہاڑی مقام سے باہر رسول اللہؐ کے انتظار میں نکل جایا کرتے اور وہیں ٹھہرے رہتے یہاں تک کہ دھوپ سایہ دار مقامات پر پھیل جاتی۔ غرض ۴ ستمبر ۶۲۲ عیسوی کو ایک یہودی نے افق پر غبار کے ایک بادل کی نشان دہی کی اور بلند آواز کے ساتھ انصار سے کہنے لگا: ''اے بنی قیلہ! وہ ذی شان ہستی آ گئی جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔'' پھر مرد، عورتیں اور بچے نبی پاکؐ کی جانب امنڈ پڑے۔ اس وقت آپؐ ابوبکرؓ کے ہمراہ کھجور کے ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابوبکرؓ نے تین دن تک قبا میں قیام کیا۔ لیکن مدینہ کے

Marfat.com

مسلمان حضورؐ کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ چنانچہ آپؐ ان لوگوں سے ملاقات اور مستقبل کی رہائش کے بارے میں فیصلہ کرنے کی غرض سے چل پڑے۔ راستے میں لوگوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ اونٹنی سے اتر کر ان کے ہاں قیام کریں لیکن آں حضرتؐ نے نہایت شائستگی کے ساتھ انکار کر دیا کیونکہ آپؐ مدینہ کے اندر متحارب گروپوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ غرض آپؐ نے قصویٰ کی مہار کھلی چھوڑ دی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کی رہنمائی کرے۔ آخر قصویٰ نے ایک ایسی جگہ پر گھٹنے ٹیک دیے جو ایک انصاری کی ملکیت تھی اور جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ حضورؐ اونٹنی سے نیچے اتر گئے اور اپنا سامان ایک قریبی مکان میں رکھوا دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے اس جگہ کو خریدنے کے لیے اس کے مالک سے بات چیت شروع کر دی۔ جب زمین کی قیمت طے ہو گئی تو سب مسلمان رسول اللہؐ کا مکان بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ جگہ مسجد کے طور پر بھی استعمال ہونے لگی۔ چونکہ قریش ہاتھ سے کام کرنے کے عادی نہیں تھے، اس لیے حضورؐ کے خوبصورت اور نفیس الطبع داماد عثمانؓ بن عفان اس محنت شاقہ کی وجہ سے تھکن سے چور ہو گئے۔

مسلمانوں کی پہلی مسجد عالی شان اور پرشکوہ نہیں تھی لیکن یہ مسجد بعد میں تعمیر ہونے والی تمام مساجد کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔ بنیادی طور پر یہ ایک کھلی اور وسیع و عریض جگہ تھی جہاں پوری ملت اسلامیہ باجماعت نماز ادا کرتی تھی اور جس سے ابتدائے اسلام کی مثالی سادگی کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی۔ مسجد کی چھت کو درختوں کے تنے سے سہارا دیا گیا تھا اور وہاں کوئی پرتکلف اور مرصع منبر نہیں تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکڑی کے بنے ایک سادہ منبر پر کھڑے ہو کر مسلمانوں سے خطاب کرتے۔ حضورؐ اور آپؐ کی ازواج مطہراتؓ مسجد کے سامنے ایک بڑے صحن میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے حجروں میں رہتے۔ یہاں ہر قسم کے اجتماعات ہوتے اور مدینہ کے غریب لوگوں میں خیرات اور کھانے پینے کی چیزیں بھی بانٹی جاتیں۔

مدینہ میں ایستادہ عجز و انکسار کی علامت یہ عمارت توحید کے مثالی نظریے کی بھرپور غمازی کرتی تھی۔ (Clinton Bennet: Islam: Fatima Mernissi: Women and Islam)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جنسی، مذہبی اور گھریلو زندگی آپس میں مربوط ہو سکتی ہے اور اسے بہ ہر حال مربوط ہونا چاہیے۔ اسی طرح سیاست، فلاح و بہبود اور سماجی زندگی میں نظم و ضبط کو تقوے اور پرہیزگاری کے دائرے میں لانا چاہیے۔ ازواجِ مطہراتؓ کو مسجد نبوی کے نزدیک حجروں میں ٹھہرا کر حضورؐ یہ اعلان کر رہے تھے کہ سرکاری اور نجی زندگی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی مردوں اور عورتوں میں جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق کرنی چاہیے۔ اسلام میں زہد اور پرہیزگاری کا مطلب تجرد نہیں، شراکت کار ہے۔ اگر یہودی اور عیسائی چاہتے تو وہ بھی اس مسجد میں عبادت کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھی خدا کے خاندان کا حصہ تھے۔

Marfat.com

ہجرت کے سات ماہ بعد اپریل ۶۲۳ عیسوی میں مسجد کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا۔ مسجد کی شمالی دیوار میں اس جانب، جدھر سے بیت المقدس کا رخ تھا، ایک مختصر خلا رکھا گیا جہاں پتھر رکھ دیے گئے۔ یہ قبلے کا نشان تھا جس طرف منہ کر کے مسلمان نماز پڑھتے تھے۔ شروع میں مسلمان کسی باضابطہ بلاوے کے بغیر نماز پڑھتے لیکن یہ کوئی تسلی بخش طریق کار نہیں تھا کیونکہ اس طرح ہر شخص مختلف اوقات میں نماز ادا کرتا۔ چنانچہ نبی کریمؐ نماز کے لیے یہود کے مینڈھے کا سینگ یا مقامی عیسائیوں کا ناقوس استعمال کرنے کے امکانات پر غور کرنے لگے۔ لیکن اس دوران ایک مہاجر نے خواب میں سبز چوغے میں ملبوس ایک شخص کو دیکھا جس نے اسے اذان دینے کا طریقہ سکھایا اور کہا کہ اذان کی ابتدا ''اللہ اکبر'' (اللہ سب سے بڑا ہے) سے کی جائے جو مسلمانوں کی اولیں ترجیح کی یاددہانی ہے۔ حضورؐ نے اذان کے اس طریقے کو پسند کیا اور اس مقصد کے لیے حبشہ کے سابق غلام بلالؓ کا انتخاب کیا گیا جن کی آواز بہت بلند تھی۔ حضرت بلالؓ سحر کے وقت مسجد کے قریب ایک بلند مکان کی چھت پر چڑھ کر فجر کا انتظار کرتے۔ جب اذان کا وقت ہو جاتا تو وہ سیدھے کھڑے ہو جاتے اور کہتے: ''یا اللہ! میں تیری تعریف کرتا ہوں اور قریش کے مقابلے میں تیری مدد کا خواہاں ہوں کہ وہ تیرے دین پر سیدھے قائم ہو جائیں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۱۴: The Life of Muhammad)۔ گو کہ مسلمانوں نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا لیکن وہ مکہ کو نہیں بھولے تھے۔ مہاجرین پردیس میں جس بے کسی کے عالم میں تھے، حضورؐ کو اس کا پورا احساس تھا چنانچہ آپؐ نے یہ دعا فرمائی: ''یا اللہ! ہمارے لیے مدینہ کو بھی ویسا ہی محبوب بنا دے جیسا کہ تو نے مکہ کو ہمارے لیے پسندیدہ بنا دیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۱۴: The Life of Muhammad, p.280)۔

ہجرت کے ذریعے مسلمانوں کو مکمل طور پر اپنا گھر بار چھڑانے اور دیار غیر میں آباد کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ وہ اب بھی قبائلی اصطلاح استعمال کرتے تھے، اس کے باوجود مسلمانوں کو ایک مختلف نوع کی برادری تشکیل دینا ہوگی۔ رسول کریمؐ کے ابتدائی اقدامات میں سے ایک ''مواخات'' کا عمل تھا جس کی رو سے مکہ کے ہر مہاجر کو مدینہ کے ایک انصاری کا بھائی بنا دیا گیا۔ اس طرح خونی رشتوں اور قرابتداری سے ماورا ایک نئی برادری معرض وجود میں آ گئی۔ جب بارہ میں سے پہلے نگران انصاری کا انتقال ہوا تو مہاجرین اور انصار کی جداگانہ سیاسی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔ اس طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سیاسی منصب سنبھال لیا۔ (Bamyeh: Social Origins of Islam, p.218)۔ مسلمان بتدریج ایک ''نئے قبیلے'' میں ڈھل رہے تھے جو پرانی قرابت داری سے بالکل مختلف تھا۔ جن مسلمانوں نے ہجرت کی، وہ مکہ میں رہ جانے والے اپنے ہی قریبی مسلمانوں سے نمایاں اور ممتاز تھے۔ بہ ہر حال مسلمانوں کا تعلق کسی بھی قبیلے یا گھرانے

Marfat.com

سے ہو، انہیں آپس میں کبھی نہیں لڑنا چاہیے۔ مہاجرین اور انصار ایک روایتی قبیلے کی طرح پوری طرح متحد تھے۔ (جولوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور مدد دی، یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی، تمہارے لیے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا ضروری ہے، سوائے ان لوگوں کے کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے، تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ خوب جانتا ہے۔ کافر آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ملک میں فتنہ ہوگا اور زبردست فساد ہو جائے گا۔ سورہ الانفال آیات ۷۲، ۷۳۔ مترجم)۔ قبیلے کی طرح امت کو بھی ''ایک ہی برادری'' کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے غیر مسلم اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایک وفاق تشکیل دے دیا۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۳۴۱: The Life of Muhammad, p.232)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امت مسلمہ کے سردار کی حیثیت سے اب ان اخلاقی اور سماجی اصلاحات کو نافذ کر سکتے تھے جن پر مکہ میں عمل درآمد ممکن نہیں تھا۔ آپؐ کا نصب العین حلم کا معاشرہ قائم کرنا تھا۔ مومنین صرف ایمان لانے والے نہیں تھے، انہیں اپنے عقائد کا عملی اقدامات کے ذریعے اظہار کرنا تھا۔ انہیں نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ بے کسوں اور ناداروں کو اپنی دولت میں حصے دار بنانا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں امت سے متعلق معاملوں پر باہمی صلاح مشورہ کرنے کا بھی حکم دیا گیا تا کہ ملت اسلامیہ کا اتحاد برقرار رہ سکے۔ اگر ان پر حملہ کیا جاتا تو وہ اپنا دفاع کر سکتے تھے البتہ انہیں پرانی بے لگام جاہلیت کے انتقام اور غیظ و غضب کے بجائے دشمن کو معاف کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ بدلہ لینے کے سلسلے میں ''مروہ'' کے اصولوں کے مطابق ان پر جو فرض عاید ہوتا تھا، اب انہیں اس سے سبکدوش کر دیا گیا۔ قرآن کریم میں واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے دشمن کو معاف کر دے اور اس سے صلح کر لے تو اس کا اجر خدا تعالیٰ کے ذمے ہے۔

لیکن یہ تبدیلی راتوں رات نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جاہلیت کی پرانی روح اب بھی مسلمانوں کے دلوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ ہجرت کے فوراً بعد ایک مشرک عرب نے مسلمانوں کے ایک اژدہام کو، جن میں اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ شامل تھے، اس حال میں دیکھا کہ وہ اس طرح محبت اور تلطف کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جیسے ان میں اس سے پہلے کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ مشرک سخت غضبناک ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اسلام مسلمانوں کو نرم خو اور نرم دل بنا رہا تھا۔ اس مشرک نے ایک یہودی نوجوان سے کہا کہ وہ ان مسلمانوں کے پاس جا کر وہ نظمیں پڑھنا شروع کر دے جن سے پرانی اور تلخ دشمنی کی یاد تازہ

Marfat.com

ہو جائے۔ اس پر قبائلی جنگجویانہ جذبات پھر بھڑک اٹھے اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو گلے سے پکڑ لیا۔ چنانچہ رسول کریمؐ یہ خبر سن کر پریشانی کے عالم میں فوری طور پر موقعے پر پہنچ گئے اور آپؐ نے فرمایا: ''اے گروہ مسلمین! (خدا سے ڈرو، خوفِ خدا کرو)، کیا جاہلیت کے دعووں پر لڑے پڑتے ہو حالانکہ میں تم میں موجود ہوں! تمہیں اللہ نے اسلام کی ہدایت دی، عزت بخشی اور اس اسلام کے ذریعے جاہلیت کی باتیں تم سے الگ کر دیں اور اس کے ذریعے تمہیں کفر سے نجات دلائی اور تمہارے دلوں کے درمیان الفت پیدا کر دی۔'' یہ سن کر یہ لوگ سخت شرمندہ ہوئے، وہ رو پڑے اور اوس اور خزرج کے افراد ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۸۶)۔

مدینہ کے سب مسلمانوں نے صدق دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بعض لوگ محض دنیاوی فوائد حاصل کرنے کی غرض سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور وہ گومگو کی کیفیت میں اس نئی مہم کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے۔ قرآن نے انہیں منافقین کا نام دیا ہے کیونکہ یہ لوگ دین اسلام سے مخلص نہیں تھے اور وہ اپنا ارادہ تبدیل کرتے رہتے تھے۔ (منافقوں کو اس امر کی خبر پہنچا دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب یقینی ہے۔ سورہ النسا آیت ۱۳۸۔ مترجم)۔ جب وہ مخلص مسلمانوں سے ملتے تو کہتے کہ ہم بھی تمہاری طرح ایمان لائے ہیں۔ لیکن جب یہ لوگ دوسروں سے ملتے جن کے دلوں میں شکوک وشبہات موجود تھے تو انہیں یقین دہانی کراتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار ہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہؓ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! یقیناً یہی بیوقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے۔ سورہ البقرہ آیات ۸ تا ۱۵۔ مترجم)۔ منافقین کا لیڈر ابن ابی تھا جو بظاہر اسلام قبول کر چکا تھا لیکن نئے دین کا نکتہ چیں اور مخالف تھا۔ حضورؐ اس کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آتے۔ آپؐ

Marfat.com

نے اسے نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرنے کی بھی اجازت دے رکھی تھی لیکن اس کے چھپے ہوئے جارحانہ عزائم وقتاً فوقتاً کھل کر سامنے آ جاتے۔ایک مخصوص واقعے کے بعد ایک انصاری نے آپؐ سے درخواست کی: ''یارسول اللہؐ! اس سے نرمی فرمایئے کیونکہ واللہ! اللہ آپؐ کو ایسے وقت پر ہمارے پاس لایا جب ہم اس کے لیے تاج تیار کر رہے تھے اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس کی حکومت چھین لی۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۴۱: The Life of Muhammad)۔

نو واردوں کے ساتھ بعض یہودیوں کا رویہ بھی جارحانہ تھا۔رسول کریمؐ کو یہ توقع نہیں تھی کہ یہودی اسلام قبول کر لیں گے۔حضورؐ کے ساتھ ان کا تنازع بنیادی طور پر مذہبی نہیں، سیاسی اور اقتصادی نوعیت کا تھا۔نخلستان میں یہودیوں کی پوزیشن مخدوش ہوتی جا رہی تھی اور اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اوس اور خزرج کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہود کی سابق بالادستی بحال ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ یہودیوں کے تین بڑے قبیلوں نے ابن ابی اور نخلستان کے ان مشرک عربوں کی حمایت کرنے میں ہی عافیت سمجھی جو رسول اللہؐ کی بدستور مخالفت کر رہے تھے۔(Watt: Muhammad at Madina, pp 201-2)۔ابتدائی مسلمان مورخ ہمیں بتاتے ہیں کہ ان یہودیوں نے قرآنی نظریات اور عقائد پر بھی بحث ونزاع شروع کر دی تھی۔آٹھویں اور نویں صدی میں بھی یہود اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے مناظرے ہوتے رہے ہیں:

i- D.S. Margoliouth: The Relations Between Arabs and Israelities Prior to the Rise of Islam.

ii- Salo Wiltmayer Baron: A Social and Religious History of Jews.

iii- Hanna Rehman: The Conflicts Between the Prophet and the Opposition in Medina.

iv- Moshe Gil: The Medinan Opposition to the Prophet.

ساتویں صدی عیسوی کے مدینہ کے یہودیوں کو تورات اور تلمود کا بہت کم علم تھا۔وہ اپنے مذہب پر سختی سے عمل نہیں کرتے تھے بلکہ بیشتر یہود اپنے مذہب کو عربوں کے دین کی تبدیل شدہ شکل تصور کرتے تھے۔

S.N. Goitein: Jews and Arabs: Newby: History of the Jews, Aslan: No god but God, pp.97,98

کسی عرب پیغمبر کے ظہور کا نظریہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح ابن سید نامی شخص ان کا اپنا پیغمبر تھا جو ایک لبادہ اوڑھتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ وہ خدا کا نبی ہے اور اس پر ربانی کلام نازل

Marfat.com

ہوتا ہے۔

David J.Helperin: The Ibn Sayyad Traditions and the Legend of Dajjal

مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے مباحث اور مناظرے اگرچہ علمی اعتبار سے زیادہ وقیع نہیں تھے، اس کے باوجود ان کی وجہ سے مسلمانوں کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد ابن اسحاق نے ہمیں بتایا ہے کہ جب یہ لوگ مسجد میں آتے تو بعض یہودی قرآن کریم کا مضحکہ اڑاتے اور ہنسی مذاق کرتے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۶۲)۔ کئی یہودیوں کا رویہ دوستانہ تھا اور رسول کریمؐ نے غالباً ان سے بہت کچھ سیکھا البتہ آپؐ کو اہل کتاب کے بعض نظریات پر سخت حیرت ہوئی۔ حضورؐ کو فرقہ وارانہ مناقشوں سے نفرت تھی۔ (آپؐ کہہ دیجیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرما دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں، خواہ پوشیدہ اور جن کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ، ان کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورہ الانعام آیت ۱۵۱۔ مترجم)۔ آں حضرتؐ کو ''منتخب لوگوں'' کے نظریے یا اس عقیدے سے بھی صدمہ پہنچا کہ صرف یہودی یا عیسائی ہی جنت میں جائیں گے۔ (یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل پیش کرو۔ سنو! جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے بے شک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔ یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی حق پر نہیں حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم کہتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان کے درمیان کر دے گا۔ سورہ البقرہ آیات ۱۱۱ تا ۱۱۳۔ مترجم۔ آپؐ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپؐ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اور اگر آپؐ نے باوجود اپنے پاس علم آ جانے کے پھر ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے پاس آپؐ کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ مددگار۔ سورہ البقرہ آیت ۲۰۔ مترجم)۔ رسول کریمؐ یہ جان کر بھی پریشان ہو گئے کہ بعض عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ایک تثلیث ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ (یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، (نہیں بلکہ) وہ پاک ہے زمین و آسمان کی تمام مخلوق اس کی ملکیت ہے اور ہر ایک اس کا فرماں بردار ہے۔ سورہ البقرہ آیت ۱۱۶۔ مترجم۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ اللہ رحمان نے بھی اپنی اولاد اختیار کی ہے۔ یقیناً تم بہت بری اور بھاری چیز لائے ہو۔ قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو

Marfat.com

جائیں۔ کہ وہ رحمان کی اولاد ثابت کرنے بیٹھے۔ شان رحمان کے لائق نہیں کہ وہ اولاد رکھے۔ سورہ مریم آیات ۸۸ تا ۹۲۔ مترجم۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو کسی کا محتاج نہیں۔ اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔ کیا اللہ کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ سورہ یونس آیت ۶۸۔ مترجم۔ بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جن کا قول ہے کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے حالانکہ خود مسیح نے ان سے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے، یقین مانو کہ جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے اور گناہ گاروں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ لوگ بھی کافر ہو گئے جنہوں نے کہا، اللہ تین میں کا تیسرا ہے، دراصل سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے، انہیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا۔ یہ لوگ کیوں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں جھکتے اور کیوں استغفار نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ تو بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔ مسیح ابن مریم پیغمبر ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں، اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو چکے ہیں، ان کی والدہ ایک راست باز خاتون تھیں۔ دونوں ماں بیٹے کھانا کھایا کرتے تھے۔ آپؐ دیکھیے کہ کس طرح ہم ان کے سامنے دلیلیں رکھتے ہیں پھر غور کیجیے کہ کس طرح وہ پھرے جاتے ہیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے۔ اللہ ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے۔ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو اور زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے بہک چکے ہیں اور بہتوں کو بہکا بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ سورہ المائدہ آیات ۷۳ تا ۷۷۔ مترجم۔ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ اللہ کے معبود قرار دے لو! عیسیٰ عرض کریں گے کہ میں تو تجھ کو منزہ سمجھتا ہوں، مجھ کو کسی طرح زیبا نہیں تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تجھ کو اس کا علم ہوگا۔ تو تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتا ہے۔ اور میں تیرے نفس میں جو کچھ ہے، اس کو نہیں جانتا۔ تمام غیبوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جو تو نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی ان پر مطلع رہا۔ اور تو ہر چیز کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو زبردست حکمت والا ہے۔ سورہ المائدہ آیات ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ مترجم۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس عقیدے پر بدستور قائم رہے کہ یہ مخصوص نظریات محض ایک فریب خوردہ اقلیت نے اپنا رکھے ہیں۔ (وہ لوگ بھی قطعاً کافر ہو گئے جنہوں نے کہا، اللہ تین میں کا تیسرا

Marfat.com

ہے۔ دراصل سوا اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے، انہیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا۔ سورہ المائدہ آیت ۷۳۔ مترجم)۔ قرآن کریم مسلمانوں کو یہ یاددہانی کراتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بھی کئی لوگ حق پر قائم رہنے والے ہیں۔

یہ سارے کے سارے ایک جیسے نہیں بلکہ ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی ہے جو راتوں کے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ نیک بخت لوگوں میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی بھلائیاں کریں ان کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ (سورہ آل عمران آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵)۔

مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قوم ایک مخصوص الہامی دین پر کاربند ہے، اس لیے انہیں کبھی ختم نہ ہونے والے ایسے بحث مباحثوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ اگر اہل کتاب اسلام پر حملہ کریں تو مسلمانوں کو حلم اور بردباری سے یہ جواب دینا چاہیے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کے بارے میں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بے کار تنازعے سے بچنے کے لیے حنیف کی طرح حضرت ابراہیمؑ کے دین کی جانب مراجعت کرنے کا فیصلہ کر لیا جو نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی کیونکہ وہ تورات اور انجیل نازل ہونے سے بہت پہلے پیغمبر تھے۔ (اے اہل کتاب؛ تم ابراہیم کی بابت کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئیں؟ کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟ سورہ آل عمران آیت ۶۵۔ مترجم)۔ ہجرت کے بعد قرآن حکیم نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ''حنیف'' اور ''حنیفیہ'' کے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیے البتہ ان لفظوں کی ایک نئے پیرائے میں تشریح کی گئی۔ رسول کریمؐ کے نزدیک حنیفیہ کا سادہ مطلب تھا خدا کی کامل اطاعت! گزشتہ آسمانی صحیفوں میں تحریف سے پہلے پیغمبروں کا اصلی اور غیر تحریف شدہ پیغام یہی تھا۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کسی مخصوص مسلک کے پیروکار نہیں تھے، وہ تو صرف ''مسلم'' اور خدا کے فرماں بردار اور ''خالص عقیدے'' کے علمبردار حنیف تھے۔ (ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو یک طرفہ (خالص) مسلمان تھے، وہ مشرک بھی نہ تھے۔ سورہ آل عمران آیت ۶۷۔ مترجم)۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام نے جب خانہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کیا تو انہوں نے کوئی مخصوص مذہب یا عقیدہ پیش نہ کیا بلکہ وہ صرف اپنی زندگیوں کو خدا کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خدا کے حضور دعا کی تھی: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا اطاعت گزار بنا اور ہمیں عبادت کے طریقے سکھا۔'' قریش نے مسلمانوں کو مذہبی عدم رواداری کی وجہ سے مکہ سے نکال باہر کیا تھا لہٰذا مسلمانوں کو گروہ بندی سے گریز کرنا چاہیے۔ (بے شک جن لوگوں نے اپنے

Marfat.com

دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، آپؐ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پس ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے۔ سورہ الانعام آیت ۱۵۹۔ مترجم)۔ انہیں غصے اور کرختگی سے یہ اصرار کرنے کے بجائے کہ حق وصداقت پر صرف انہیں اجارہ داری حاصل ہے، سچے مسلمانوں کی طرح یہ کہنا چاہیے: ''آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین مستحکم ہے جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جو اللہ کی طرف یک سو تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ آپؐ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔'' (سورہ الانعام آیات ۱۶۱ تا ۱۶۳۔ مترجم)۔ انسانوں کو صرف اللہ کی ذات پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے کیونکہ کسی مخصوص مذہبی روایت پر فخر کرنا بت پرستی کے مترادف ہے۔

جنوری ۶۲۴ عیسوی کے آخر میں رسول کریمؐ پر اس وقت وحی نازل ہوئی جب آپؐ نماز جمعہ کی امامت فرما رہے تھے۔ اس وحی کی رو سے مسلمانوں کے لیے بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ اب انہیں خالص دین کے علمبردار حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا۔

ہم آپؐ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب ہم آپؐ کو اس قبلے کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپؐ خوش ہو جائیں گے، آپؐ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپؐ جہاں کہیں ہوں، اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔ اہل کتاب کو اس بات کے برحق ہونے کا قطعی علم ہے، اور اللہ تعالیٰ ان اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں۔ (سورہ البقرہ آیت ۱۴۴۔ مترجم)۔

قبلے کی تبدیلی سے مسلمانوں کو یہ یاد دہانی کرائی گئی کہ وہ کسی مسلمہ سابق مذہب کے پیروکار نہیں بلکہ خدا کے اطاعت گزار ہیں۔ یہ آزادی اور خودمختاری کا اعلان تھا۔ اب مسلمانوں کو یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ وہ محض پرانے ادیان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ خدا نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ''تم ان سے نہ ڈرو مجھ ہی سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور اس لیے بھی کہ تم راہِ راست پاؤ۔'' (سورہ البقرہ آیت ۱۵۰۔ مترجم)۔ نئے قبلے کے تعین سے مہاجرین اور انصار دونوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ پہلے سے زیادہ مضبوط رشتوں میں منسلک ہو گئے۔ ان سب کو خانہ کعبہ سے محبت تھی جس کی جڑیں دور افتادہ شہر کے مقابلے میں عرب روایت میں بہت گہری تھیں۔ لیکن اس مرحلے پر ایک مسئلہ درپیش تھا، خانہ کعبہ مکے میں تھا اور قریش کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات اب حد درجہ کشیدہ ہو چکے تھے۔

Marfat.com

چوتھا باب

جہاد

قبلے کی تبدیلی کا واقعہ اس وقت رونما ہوا جب غیر یقینی صورت حال کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کی برادری الجھنوں اور افراتفری کے زمانے میں رہنمائی کے لیے جاں گسل جدوجہد کرتی رہی تھی۔ حضورؐ جانتے تھے کہ ایک پیغمبر کو دنیا میں نمایاں کارنامہ انجام دینا چاہیے۔ آپؐ دوسروں کے معمولات اور رویوں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ حضورؐ کو خدائی احکام کو عملی جامہ پہنانے اور ایک منصفانہ اور استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا البتہ ہجرت نے مسلمانوں کو ایک مشکل اور غیر معمولی صورت حال سے دوچار کر دیا۔ گو کہ رسول اللہؐ سماجی اصلاحات نافذ کرنے کا عمل شروع کر چکے تھے، اس کے باوجود آپؐ جانتے تھے کہ جب تک آپؐ خود کو مدینہ تک محدود رکھیں گے، عرب پر اس کا کوئی مستقل نقش ثبت نہیں ہوگا۔ ''شہروں کی ماں'' مکہ کو جزیرہ نما کی ترقی میں ایک فیصلہ کن مقام حاصل تھا۔ عرب کو قریش کی تجارتی ذہنیت کی ضرورت تھی۔ مکہ کو اب عالم اسلام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، مسلمان نماز کے دوران دن میں پانچ مرتبہ مکہ کے ساتھ محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے لیکن کعبے کو اب بھی ایک دور افتادہ اور ناقابل رسائی محبوب کا مقام حاصل تھا۔ (Muhammad A. Bamyeh: The Social Origins of Islam, p.198) مسلمان ابھی تک دوسرے عربوں کی طرح حج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آں حضرتؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے مکہ کو ایک چابی کی حیثیت حاصل ہے۔ قریش کے جارحانہ طرز عمل کی وجہ سے امت مسلمہ کو قبائلی نقشے سے ہمیشہ کے لیے محو کر کے اسے ایک سیاسی مقام کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ مکہ کے بغیر اسلام کی حیثیت محض

Marfat.com

ثانوی تھی۔ بہ ہرحال حضورؐ کو اپنے لوگوں کے ساتھ امن قائم کرنا تھا۔لیکن ہجرت کے پہلے صدمے کے بعد قریش بظاہر مسلمانوں کے بارے میں سب کچھ بھول گئے۔ مکہ کے ساتھ مصالحت سے پہلے رسول کریمؐ کے لیے ضروری تھا کہ آپؐ قریش کو اپنی جانب متوجہ کرتے۔

رسول اللہؐ کو مدینہ میں بھی اپنی پوزیشن کو بہتر بنانا تھا۔آپؐ جانتے تھے کہ مدینہ کے بیشتر لوگ ابھی تک آپؐ کی آزمائش کر رہے ہیں۔انہوں نے مہاجرین کو پناہ دے کر قریش کا خم ٹھونک کر مقابلہ کرنے کا اس لیے فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس سے انہیں مادی فائدے کی بھی توقع تھی۔اب حضورؐ کو انہیں بھی دنیاوی فوائد سے بہرہ مند کرنا تھا۔آپؐ کو کم سے کم اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ مہاجرین مدینہ کی معیشت پر بوجھ نہ بنیں۔ مہاجرین کو اپنی گذراوقات کے لیے روزی کمانا بہت مشکل تھا۔ان میں سے زیادہ تر لوگ تاجر یا بینکار تھے لیکن مدینہ میں تجارت کے بہت کم مواقع موجود تھے کیونکہ یہاں عرب اور یہود قبائل نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔مہاجرین کو کھیتی باڑی کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور تمام دستیاب زمین پر لوگوں کا پہلے سے قبضہ تھا۔ جب تک وہ خود اپنی آمدنی کا ذریعہ پیدا نہ کرتے، وہ انصار پر بوجھ بنے رہتے۔آمدنی کے لیے صرف ایک طریقہ ہی قابل عمل ہوسکتا تھا۔

اہل مکہ کے شام آنے جانے والے تجارتی قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے مدینہ نہایت موزوں مقام تھا اور مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد حضورؐ نے قریش کے کاروانوں پر حملے کے لیے مہاجرین کے دستے بھیجنا شروع کر دیے۔ (W.Montgomery Watt: Muhammad at Medina, pp.2-5)۔ ان حملوں کا مقصد خوں ریزی نہیں، اونٹ، سامان تجارت اور ان قیدیوں کو پکڑ کر، جن کے عوض تاوان مل سکتا تھا، اپنی آمدنی کا وسیلہ پیدا کرنا تھا۔اس کارروائی پر کسی شخص کو صدمہ نہ ہوا۔غزوہ مشکل اوقات میں معمول کی کارروائی تھی تاہم بعض عربوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ مسلمانوں میں طاقتور قریش پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے، خاص طور پر اس وجہ سے کہ یہ لوگ کوئی آزمودہ کار جنگجو نہیں تھے۔ہجرت کے بعد ابتدائی دو برسوں میں رسول اللہؐ نے آٹھ مہمیں روانہ کیں۔ان غزووں میں آپؐ خود شامل نہ ہوئے بلکہ آپؐ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ ابن الحارث جیسے لوگوں کو قیادت سونپ دی۔ چونکہ تجارتی قافلوں کی نقل وحرکت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا بہت مشکل تھا اس لیے ان میں سے کوئی بھی حملہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔

قریش جنگ وجدل کے عادی نہیں تھے۔انہوں نے طویل عرصے سے خانہ بدوشی کی زندگی کو خیرباد کہہ دیا تھا اس لیے وہ جنگ کی عادت اور اس میں مہارت دونوں سے محروم ہو چکے تھے۔قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مہاجرین جنگ لڑنے کو ناخوشگوار عمل تصور کرتے تھے۔ (تم پر جہاد فرض کیا گیا گو وہ تمہیں دشوار

Marfat.com

معلوم ہو، ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لیے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو حالانکہ وہ تمہارے لیے بری ہو۔ حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو۔ سورہ البقرہ آیت ۲۱۶۔ مترجم)۔

لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مایوس نہ ہوئے۔ اگرچہ مہاجرین کو آمدنی کی سخت ضرورت تھی، اس کے باوجود ان کا بنیادی مقصد لوٹ مار کرنا نہیں تھا۔ مسلمان مہاجرین عسکری مہم سے خالی ہاتھ لوٹ آتے لیکن مکہ کی توجہ بہ ہر حال ان کی طرف مبذول ہو جاتی۔ قریش چوکنے ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں جو اس سے پہلے کبھی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ تاجر خود کو زیادہ کمزور اور غیر محفوظ سمجھنے لگے، انہیں طویل متبادل راستے اختیار کرنا پڑتے، اس طرح مکہ سے تجارتی آمدورفت میں خلل پڑ گیا۔ ستمبر ۶۲۳ عیسوی میں رسول کریمؐ نے قریش کے بڑے تجارتی قافلے پر حملے کی قیادت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس قافلے کی قیادت امیہ بن خلف کر رہا تھا۔ چونکہ بہت سا مال غنیمت ملنے کی توقع تھی اس لیے کوئی دو سو مسلمان رضا کارانہ طور پر اس مہم پر روانہ ہو گئے جو ایک ریکارڈ تھا۔ لیکن اس مرتبہ بھی یہ قافلہ بچ نکلا اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔

بے آب و گیاہ ریگستانوں میں غزوے کے لیے کسی نظریاتی جواز کی ضرورت نہیں تھی، اسے شدید تنگی اور قلت کے زمانے میں ناگزیر ضرورت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن حضورؐ نے پرانی قبائلی رسموں کے حدود سے آگے جانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کافروں کے ساتھ صلح سے رہیں اور جب وہ کاروبار میں مصروف ہوں تو ان پر حملہ نہ کریں۔ آں حضرتؐ کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد آپؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں زیادہ جنگجویانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا:

جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انہیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ بے شک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے۔

یہ وہ ہیں جنہیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا، صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھا دی جاتیں جہاں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ (سورہ الحج آیات ۳۹، ۴۰۔ مترجم)۔

قرآن کریم نے منصفانہ جنگ کے قدیم نظریے کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ ریگستان میں جارحانہ لڑائی کو قابل تعریف سمجھا جاتا تھا لیکن قرآن نے صرف اپنے دفاع میں جنگ لڑنے کو جائز قرار دیا اور جنگ میں پہل کرنے کی مذمت کی گئی۔ (لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ

Marfat.com

زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سورہ البقرہ آیت ۱۹۰۔ مترجم)۔ جنگ ہمیشہ سے ایک خوفناک برائی رہی ہے البتہ بعض اوقات عبادت کرنے کی آزادی جیسی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے لڑائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی قرآن نے کثرت مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے صومعوں، گرجا گھروں اور مسجدوں کی حفاظت پر زور دیا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرتے تھے کہ ان پر ایک خوفناک حملہ ہوا ہے، مکہ سے ان کا اخراج ایک ایسی کارروائی تھی جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ عرب میں قبیلے سے جلاوطنی پر سخت پابندی عاید تھی، اس کی خلاف ورزی کر کے مسلمانوں کے تشخص پر کاری ضرب لگائی گئی تھی۔

لیکن رسول خداؐ نے ایک پرخطر راستہ اختیار کیا تھا۔ آپؐ ایک پرتشدد معاشرے میں رہتے تھے اور آپؐ ان غزووں کو نہ صرف آمدنی کا ذریعہ، جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی، بلکہ قریش کے ساتھ تنازعے کی عقدہ کشائی بھی تصور کرتے تھے۔ ہم موجودہ دور میں بھی یہ مشاہدہ کر چکے ہیں کہ قیام امن کے لیے جنگ کرنا ایک پرخطر مہم جوئی ہے۔ جنگ کی شقاوت اور سنگدلی ان اقدامات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے جو ایسے اصولوں کی تضحیک کا باعث بنتے ہیں جن کی سربلندی کے لیے سپاہی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آخر میں کوئی بھی فریق اعلیٰ اخلاقی بنیاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رسول عربیؐ نے اپنے غزووں کی اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن آپؐ کو طویل عسکری مہم کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے تجربے سے آپؐ کو یہ معلوم ہو گیا کہ اگر ایک مرتبہ لڑائی شروع ہو جائے تو تشدد کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کا اپنا زور حرکت ہوتا ہے اور جس پر کنٹرول ممکن نہیں رہتا۔

پیغمبر اسلامؐ نے شروع میں روایتی قوانین کے مطابق جنگ کی لیکن قبلے کی تبدیلی سے تھوڑی دیر پہلے جنوری ۶۲۴ عیسوی میں آپؐ کو یہ تجربہ ہوا کہ جنگ میں ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جن کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔

i- Watt: Muhammad at Medina, pp.6-8

ii- Social Origins of Islam, pp.198-99: The Venture of Islam

iii- Tor Andrae: Muhammad, The Man and His Faith

اب مہاجرین میں زیادہ اعتماد پیدا ہو رہا تھا۔ موسم سرما کے مہینوں میں قریش نے جنوب کی سمت میں تجارتی قافلے روانہ کیے اس لیے انہیں مدینہ سے گزرنا نہ پڑا لیکن ہمیشہ سے قریش کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے آرزومند حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ۹ آدمیوں پر مشتمل ایک مختصر جماعت کو جنوب کی طرف جانے والے ایک تجارتی کارواں پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ دوسرے مقدس مہینے رجب کے آخری دن تھے جس میں ہر قسم کی لڑائی کی ممانعت تھی۔ رجب کے آخری روز نخلہ کے مقام پر مقیم ایک چھوٹے

Marfat.com

قافلے سے اُن مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ دوسرے دن کا انتظار کرتے ہیں جس میں لڑائی کی اجازت ہے تو اس صورت میں قریش کا تجارتی قافلہ بحفاظت مکہ پہنچ جاتا چنانچہ مسلمانوں کی جماعت نے حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پہلے تیر سے ایک تاجر ہلاک اور دوسرے لوگ فرار ہوگئے البتہ مسلمانوں نے دو تاجروں کو قید کرلیا جنہیں وہ غنیمت میں ہاتھ آنے والے سامان کے ساتھ مدینہ لے آئے۔

لیکن ان حملہ آوروں کا مدینہ میں فاتح ہیروز کی طرح استقبال کرنے کے بجائے لوگ یہ سن کر خوف زدہ ہوگئے کہ حملے سے مقدس مہینے کی حرمت پامال کی گئی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چند روز تک خاموش رہے۔ آپؐ نے مکہ کے مذہب کی بیشتر روایات کو ترک کردیا تھا اور اب آپؐ کو یہ خیال گزرا کہ آپؐ مقدس مہینوں کی حرمت سے بھی سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ یہ غزوہ کامیاب ثابت ہوا تھا جس میں آپؐ کو نہ صرف قریشی تاجروں کا چھوڑا ہوا قیمتی مال ہاتھ آیا بلکہ آپؐ نے قریش کو یہ بھی دکھا دیا کہ آپؐ ان پر ان کے دروازے کی دہلیز پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس حملے کی وجہ سے مدینہ کے کئی لوگ بھی بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن یہ پوری مہم ابھی تک مشکوک تھی۔ آں حضرتؐ نے اس سے پہلے مقدس مہینوں کی حرمت کی کبھی مذمت نہیں کی تھی۔ ابتدائی ماخذ بھی اس واقعے پر مضطرب ہیں۔ رسول اللہؐ نے یہ محسوس کرلیا کہ یہ غزوہ خواہ کتنے ہی ارفع نصب العین کے لیے کیوں نہ لڑا گیا ہو، جلد یا بدیر اس کے منفی نتائج بہ ہر حال برآمد ہوں گے۔

آخر حضورؐ پر ایک نئی وحی نازل ہوئی جس میں آپؐ کی منصفانہ جنگ کے بنیادی اصول کا اعادہ کیا گیا۔ ہاں! مقدس مہینوں کے دوران جنگ کرنا غلط تھا لیکن قریش کی طرف سے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا اس سے بھی سنگین جرم تھا۔ قرآن مجید نے رسول کریمؐ کو خبردار کیا کہ قریش اس وقت تک آپؐ کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو آپؐ کو اپنا دین ترک کرنے پر مجبور کردیں:

لوگ آپؐ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت سوال کرتے ہیں، آپؐ کہہ دیجیے کہ ان میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے، یہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یہ لوگ تم سے لڑائی بھڑائی کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے مرتد کردیں اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اور اسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمال دنیوی واخروی سب غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہیں گے۔ (سورہ البقرہ آیت ۲۱۷۔ مترجم)۔

چنانچہ نبی کریمؐ نے مال غنیمت کو قبول کر کے اسے مہاجرین میں برابر تقسیم کردیا اور قیدیوں کے تبادلے کے لیے قریش سے گفت وشنید شروع کردی۔ آپؐ نے مکہ کے دو قیدی تاجروں کو ان دو مسلمانوں کے عوض رہا

Marfat.com

کرنے کا اعلان کر دیا جو ابھی تک مکہ میں تھے لیکن ہجرت کرنے کے آرزومند تھے۔ اسی اثنا میں قریش کا ایک قیدی تاجر مسلمانوں کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر مدینہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ واقعہ رسول اللہؐ کے طریق کار کی بہترین مثال ہے۔ چونکہ آپؐ سب سے جداگانہ اور منفرد پوزیشن کے حامل تھے، اس لیے آپؐ روایتی طریق کار پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ آپؐ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے اور جوں جوں نئے واقعات ظہور پذیر ہوتے، آپؐ موقع محل کی مناسبت سے صورت حال کا مقابلہ کرتے۔ آپؐ کے پاس کوئی طے شدہ ماسٹر پلان نہیں تھا اور اپنے بعض پرجوش اور تند مزاج ساتھیوں کے برعکس آپؐ کسی بھی بحرانی کیفیت میں فوری ردعمل ظاہر نہ کرتے بلکہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کچھ دیر تک معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتے۔ اس دوران آپؐ وحی کا انتظار کرتے اور اکثر اوقات آپؐ کا چہرہ مبارک زرد ہو جاتا اور آپؐ کو پسینہ آ جاتا۔

اس واقعے کے چند ہفتوں کے بعد رمضان المبارک کے مہینے (مارچ ۶۲۴ عیسوی) میں رسول اللہؐ کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک بڑا دستہ ساحلی علاقے کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ شام سے لوٹنے والے اس قافلے کو روکا جا سکے جسے ابوسفیان واپس مکہ لے جا رہا تھا۔

i- Bamyeh: Social Origins of Islam, pp. 200,231

ii- Andrae: Muhammad, pp. 203-6

iii- Watt: Muhammad at Medina, pp. 11-20

iv- Martin Lings: Mohammad, His Life Based on the Earliest Sources, pp.138-59

یہ اس سال کا سب سے اہم تجارتی قافلہ تھا اور نخلہ کی کامیابی سے حوصلہ افزائی کے باعث انصار کا ایک بڑا دستہ بھی رضاکارانہ طور پر اس مہم میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ ۳۱۴ کے قریب مسلمان مدینہ سے بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع بدر کے کنوئیں کی طرف چل پڑے جہاں انہیں توقع تھی کہ قریش کے تجارتی قافلے سے ان کی مڈبھیڑ ہو گی۔ اس معرکے کو اسلام کی ابتدائی تاریخ میں نہایت اہم واقعے کی حیثیت حاصل ہے جس سے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن اس وقت کسی شخص کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اور اسے محض ایک اور غزوہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے راسخ العقیدہ مسلمان گھروں میں ہی ٹھہرے رہے۔ ان میں حضرت عثمانؓ ابن عفان بھی شامل تھے جن کی اہلیہ اور حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ شدید بیمار تھیں۔

شروع میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ تجارتی قافلہ معمول کے مطابق بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

Marfat.com

مسلمانوں کے منصوبے کی بھنک ابوسفیان کے کانوں میں پڑ گئی چنانچہ اس نے حجاز جانے کے معمول کے راستے سے ہٹ کر قافلے کا رخ دائیں جانب ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا اور ایک مقامی قبائلی کو امداد حاصل کرنے کے لیے مکہ جانے کی غرض سے ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار کر دیا۔ قریش حضورؐ کی اس سرکشی کی خبر سن کر طیش میں آ گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ آں حضرتؐ نے ان کی عزت اور وقار پر ہاتھ ڈالا ہے۔ خبر سنتے ہی مکہ کے تمام سرکردہ قریش قافلے کو بچانے کے لیے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں ابوجہل لڑائی کے لیے سب سے زیادہ بیتاب تھا۔ فربہ اور لحیم شحیم امیہ بن خلف بھی ہتھیار بند ہو کر دوسروں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا بلکہ حضورؐ کے اپنے خاندان کے لوگ بھی آپؐ کے خلاف صف آرا ہونے کو تیار ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ اس مرتبہ آپؐ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ابولہب بیمار تھا لیکن ابوطالب کے دو بیٹے، آپؐ کے چچا عباس اور جناب خدیجہؓ کا بھتیجا حکیم بھی قریش کے ایک ہزار کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ یہ لوگ رات کے وقت مکہ سے نکل کر بدر کی طرف چل پڑے۔

اسی اثنا میں ابوسفیان مسلمانوں کو جل دے کر اپنے قافلے سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے قریش کو یہ پیغام بھیج دیا کہ اس کا قافلہ محفوظ ہے اس لیے وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ ابتدائی ماخذوں نے واضح کیا ہے کہ قافلے کے بچ نکلنے کے بعد بہت سے قریش اپنے عزیز و اقارب سے جنگ کرنے میں متذبذب تھے لیکن ابوجہل واپسی پر آمادہ نہ ہوا، کہنے لگا: ''واللہ! جب تک ہم بدر نہیں پہنچیں گے، نہیں لوٹیں گے۔ ہم تین دن تک وہاں قیام کریں گے، جانور کاٹیں گے، کھانا کھلائیں گے، شراب پلائیں گے، گانے والیاں ہمارے سامنے گائیں گی، عرب میں ہماری شہرت ہو گی۔ ہمارے جانے اور اکٹھے ہونے کی خبر پھیلے گی، پھر ان پر ہمارا رعب داب چھا جائے گا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۳۸: The Life of Muhammad, p.296)۔ لیکن ان متکبرانہ الفاظ کے باوجود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوجہل کو لڑائی کی توقع نہیں تھی۔ اسے جنگ کی تباہ کاریوں کا بھی اندازہ نہیں تھا، وہ تو اسے محض عیش و طرب کی مجلس سمجھتا تھا جس میں لڑکیاں ناچ گا کر دل لبھانے والی تھیں۔ قریش اب صحرا کی زندگی سے اس قدر دور ہو گئے تھے کہ وہ جنگ کو محض عسکری مہم جوئی سمجھنے لگے تھے جس سے مکہ کے وقار میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کے کیمپ میں قریش سے بالکل مختلف جذبات پائے جاتے تھے۔ ہجرت کے جاں گسل صدمے اور دہشت کے بعد مہاجرین زیادہ پر اعتماد نہیں تھے۔ رسول کریمؐ نے جیسے ہی یہ سنا کہ مکہ کی فوج ان کے قریب آ رہی ہے، آپؐ نے دوسرے سرداروں کے ساتھ صلاح مشورہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ وہ اسے معمول کا ایک غزوہ سمجھ رہے تھے اور انہیں بڑے پیمانے پر جنگ کی ہرگز توقع نہیں

Marfat.com

تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی سپہ سالار نہیں تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے جنگ لڑنے کا فیصلہ کرلیا جس کا اظہار سعدؓ بن معاذ نے انصار کی طرف سے حضورؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں کیا:

''بے شبہ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے، ہم نے آپؐ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ آپؐ نے جو چیز ہمارے سامنے پیش فرمائی ہے، وہ حق ہے۔ اس پر ہم آپؐ کو قول دے چکے اور آپؐ کی فرماں برداری اور اطاعت پر مستحکم وعدے کر چکے اس لیے یا رسول اللہؐ! آپؐ جہاں چاہیں، تشریف لے چلیں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اگر آپؐ سمندر بھی ہمارے سامنے لے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپؐ کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں گے اور ہمارا ایک بھی شخص پیچھے نہیں ہٹے گا۔ ہم اس بات کو ناپسند نہیں کرتے کہ آپؐ کل ہمیں اپنے ساتھ لے کر دشمن سے مقابل ہوں۔ ہم جنگ کرنے کے لیے بڑے مضبوط اور مقابلے میں کامل ہیں۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۳۵: The Life of Muhammad, p.294)۔

قریش کے برعکس اوس اور خزرج یثرب میں کئی برسوں پر محیط قبائلی جنگ کے بعد عملی سپاہی بن گئے تھے، اس کے باوجود انہیں کئی مشکلات درپیش تھیں اور سب مسلمانوں کو یہ امید تھی کہ انہیں جنگ نہیں کرنا پڑے گی۔

وادی میں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا دونوں فوجیں دو دن تک حزن اور افسردگی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ قریش اپنے نیم آستیں کے سفید ملبوسات اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والے جنگی ہتھیاروں کی وجہ سے بارعب نظر آ رہے تھے لیکن دوسری طرف سعدؓ کے اثر انگیز الفاظ کے باوجود بعض مسلمان واپس جانا چاہتے تھے اور ان کے کیمپ میں خوف کی فضا پائی جاتی تھی۔ رسول اللہؐ نے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے کی پوری کوشش کی اور انہیں بتایا کہ خدا نے ایک خواب میں آپؐ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کی امداد کے لیے ایک ہزار فرشتے بھیجے گا۔ (جیسا کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کے گھر سے حق کے ساتھ آپؐ کو روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھتی تھی۔ وہ اس حق کے بارے میں، اس کے بعد کہ اس کا ظہور ہو گیا تھا، آپؐ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکے لیے جاتا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں۔ اور تم لوگ اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ آ جائے گی اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آ جائے اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور ان کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے گو یہ مجرم لوگ ناپسند ہی کریں۔ اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سن لی کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو لگاتار چلے آئیں گے۔ سورہ الانفال آیات ۵ تا ۹۔ مترجم)۔

Marfat.com

لیکن جب قریش اس یقین سے سرشار ہو کر دعوتوں میں شراب پی رہے تھے کہ مسلمان ہتھیار ڈال دیں گے، اس وقت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عملی تیاریوں میں مصروف تھے۔ آپؐ نے نہایت منظم انداز میں مسلمانوں کو ہتھیار بند کیا اور ایک دوسرے کے قریب کھڑا کر کے بہترین طریقے سے فوج کی صف آرائی کی۔ آپؐ نے پانی کے چشموں کے قریب اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالا جس سے قریش پانی سے محروم ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قریش کو اپنا رخ مشرق کی طرف کرنا پڑتا جس سے سورج کی روشنی ان کی آنکھوں میں پڑتی۔ رسول کریمؐ نے جب قریش کے بہت بڑے لشکر کو دیکھا تو آپؐ رو پڑے: ''اے اللہ! حضورؐ نے دعا کی: ''اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تو پھر تیرا کوئی پرستار اس دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔'' (محمد ابن جریر الطبری: تاریخ الرسول والملوک:Fatima Mernissi: Women in Islam, p.90)۔ آں حضرتؐ نے محسوس کر لیا کہ یہ جنگ فیصلہ کن ہو گی۔ اگر قریش نے مسلمانوں کو واپس مدینہ جانے پر مجبور کر دیا تو عرب میں ملت اسلامیہ کی دھاک نہیں بیٹھے گی۔ مسلم سپاہ بھی رسول پاکؐ کے ان تاثرات سے آگاہ تھی چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ''اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی کہ بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست حکمت والا ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ اس پانی کے ذریعے تم کو پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسے کو دور کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے پاؤں جما دے۔ (سورہ الانفال آیات ۱۰، ۱۱۔ مترجم)۔

اسی دوران قریش زیادہ چوکنے ہو گئے۔ ان کے سرداروں نے دشمن فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لیے ایک جاسوس بھیجا لیکن جب اس شخص نے مسلمانوں کے مہیب اور پرعزم چہرے دیکھے تو ششدر رہ گیا۔ چنانچہ اس نے قریش سے کہا کہ وہ جنگ نہ کریں۔ اس نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''میں نے دیکھا کہ بلائیں موتوں کو اٹھائے لا رہی ہیں۔ یثرب کی اونٹنیوں پر موتیں دھری ہیں۔'' اسے یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا کوئی شخص قریش کے آدمی کو قتل کیے بغیر قتل نہ ہو گا۔ اس جاسوس نے مایوسی کے عالم میں قریش سے کہا کہ جب وہ لوگ اپنی تعداد کے برابر تمہیں ختم کر دیں گے تو پھر جینے میں کیا لطف باقی رہے گا؟ لیکن ابوجہل کوئی معقول بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس شخص کی طرف مڑا جس کے بھائی کو مسلمان حملہ آوروں نے نخلہ میں قتل کر دیا تھا۔ پھر وہ شخص چلا چلا کر بھائی کے خون کا بدلہ لینے کی دہائی دینے لگا۔ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے: ''اس کے بعد معاملہ سلجھنے کے قابل نہ رہا اور ارادۂ جنگ پر، جس کے لیے وہ نکلے تھے، سب کے سب مستعد ہو گئے۔'' (محمد ابن اسحاق سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۴۲:The Life of Muhammad, p.298)۔ قریش نے

Marfat.com

ریت کے ٹیلے پر آہستہ سے پیش قدمی شروع کر دی۔ رسول کریمؐ نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق جنگ میں پہل کرنے سے انکار کر دیا بلکہ لڑائی شروع ہونے کے بعد بھی آپؐ نے اپنے آدمیوں کو روکے رکھا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپؐ دعائیں ختم کر کے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دیں کیونکہ خدا انہیں یقیناً فتح سے ہمکنار کرے گا۔

خوفناک لڑائی کے پہلے مرحلے میں ہی قریش کو معلوم ہو گیا کہ انہیں بدترین صورت حال کا سامنا ہے۔ وہ لاپروائی سے دلیری کا مظاہرہ کر رہے تھے حالانکہ یہ سورماؤں کا مقابلہ تھا۔ قریش نے جنگ کے لیے کوئی مربوط حکمت عملی وضع نہیں کی تھی۔ ان کے برعکس مسلمان منظم انداز میں بہتر منصوبہ بندی کے تحت جنگ کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور صرف آخری لمحے پر تلواروں سے دست بدست لڑائی کی۔ دوپہر تک قریش مایوس ہو کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے اور ابوجہل سمیت پچاس سرکردہ افراد کی لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ اس لڑائی میں صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے۔

فتح کی خوشی سے مسرور مسلمانوں نے قیدیوں سے تلواریں لے کر انہیں گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ قبائلی جنگ میں شکست خوردوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی چنانچہ مردوں کے اعضا کاٹنے اور قیدیوں کو قتل کرنے یا ایذائیں دینے کی ابتدا ہو گئی لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دستوں کو فوری طور پر ان کاموں سے باز رہنے کا حکم دے دیا۔ اس موقعے پر خدا نے وحی کے ذریعے اس بات کو یقینی بنانے کا حکم دیا کہ جنگی قیدیوں کو یا تو رہا کر دیا جائے یا انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ (تو جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردن پر وار مارو۔ جب ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو اب خوب مضبوط قید و بند سے گرفتار کرو۔ (پھر اختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر تاوقتیکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہی حکم ہے اور اگر اللہ چاہتا تو (خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس کا منشا یہ ہے) کہ تم میں سے ایک کا امتحان دوسرے کے ذریعے لے لے، جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیے جاتے ہیں، اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ (سورہ محمد آیت ۵۔ مترجم)۔

مسلمانوں نے جنگ میں بھی ماضی کی سنگدلانہ روایات پر عمل نہ کیا اور بے رحمانہ اقدامات سے باز رہے۔

قرآن کریم مسلح تصادم کی صورت میں بھی عفو و درگزر اور رحم کرنے کی اہمیت پر مسلسل زور دیتا ہے۔ (بہت سے نبیوں کے ہم رکاب ہو کر، بہت سے اللہ والے جہاد کر چکے ہیں، انہیں بھی اللہ کی راہ میں تکلیفیں پہنچیں لیکن نہ تو انہوں نے ہمت ہاری، نہ سست رہے اور نہ دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو (ہی) چاہتا ہے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ اے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہمارے کاموں میں جو بے جا زیادتی ہوئی ہے اس سے بھی معاف فرما اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر مدد دے۔ سورہ آل عمران

Marfat.com

آیات ۱۴۶، ۱۴۷۔ مترجم)۔ جنگ کے دوران مسلمانوں کو استقلال اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، لڑائی بند ہو جائے لیکن دشمن جس لمحے امن کی درخواست کرے، مسلمانوں کو اپنے ہتھیار نیچے رکھ دینے چاہییں۔ (ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آ جائے، اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔ سورہ البقرہ آیت ۱۹۳۔ مترجم)۔ مسلمانوں کو امن کی کوئی بھی پیش کش قبول کر لینی چاہیے خواہ اس کے لیے کوئی بھی شرطیں نافذ کی جائیں اور خواہ انہیں یہ شک بھی ہو کہ دشمن دہری چال چل رہا ہے۔ گو کہ ایذا رسانیوں اور ظلم کے خلاف جنگ کرنا بہت اہم ہے لیکن قرآن مسلمانوں کو بار بار یہ یاد دہانی کراتا ہے کہ آپس میں بیٹھ کر گفت و شنید کے ذریعے مسئلہ حل کرنا بہت بہتر ہے۔ (تم ان کے مقابلے میں اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور اگر ان کے سوا اوروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں خوب جان رہا ہے اور جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔ اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسا رکھ، یقیناً وہ بہت سننے والا جاننے والا ہے۔ سورہ الانفال آیات ۱۶۰، ۱۶۱۔ مترجم)۔ یہ درست ہے کہ خدا نے تورات میں بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن اگر کوئی نیکی کے لیے بدلہ لینے کے خیال سے دست بردار ہو جاتا ہے تو صلح کرنے کے عوض اس کے ماضی کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (اور ہم نے یہودیوں کے ذمے تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے، پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں، وہی لوگ ظالم ہیں۔ سورہ المائدہ آیت ۴۵۔ مترجم)۔ انتقام صرف اسی شخص سے لیا جائے گا جس نے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا۔ یہ بدلہ لینے کے اس قدیم دستور میں بہت بڑی پیش رفت تھی جس کی رو سے قاتل کے قبیلے کے کسی بھی شخص سے بدلہ لینے کی اجازت تھی۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ وہ قریش کے پورے قبیلے کے خلاف جنگ نہیں کر رہے۔ جو لوگ اس تنازعے کے دوران غیر جانبدار رہے اور جن مسلمانوں نے مکہ میں رہنے کا فیصلہ کیا، ان پر حملہ کرنے یا انہیں زخم پہنچانے کی کسی صورت میں اجازت نہیں تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنگ کے مخالف نہیں تھے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ جنگ بعض اوقات ناگزیر بلکہ ضروری ہوتی ہے۔ معرکہ بدر کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ قریش مکہ ان سے اپنی شکست کا بدلہ جلد لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو ایک طویل اور تھکا دینے والے جہاد کے لیے وقف کر دیا۔

Marfat.com

لیکن آج ہم جہاد کے جس لفظ کو بار بار سنتے ہیں، اس کا بنیادی مطلب ''مقدس جہاد'' نہیں بلکہ وہ ''جدوجہد'' یا ''کوشش'' ہے جو خدا کی رضا اور منشا کو عملی شکل دینے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس مقصد کے لیے دماغی، سماجی، اقتصادی، روحانی اور داخلی غرض تمام محاذوں پر جدوجہد جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ انہیں بعض اوقات جنگ بھی لڑنا پڑے گی لیکن یہ ان کا سب سے بڑا فرض نہیں۔ بدر سے واپسی پر پیغمبر اسلامؐ سے یہ اہم اور اکثر نقل کیا جانے والا یہ مقولہ منسوب ہے: ''اب ہم جہاد اصغر (لڑائی) سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔'' اس جہاد اکبر سے مراد وہ زیادہ اہم اور مشکل جدوجہد ہے جو مسلمان اپنے معاشرے اور دلوں کو تبدیل کرنے کی غرض سے کر رہے تھے۔

بدر کی فتح سے نخلستان میں حضورؐ کی عظمت اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ مسلمان جب قریش کے ناگزیر جوابی حملے کا دفاع کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے، رسول اللہؐ اور مدینہ کے عربوں اور یہود قبائل کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ یہود اور عرب قبائل مسلمانوں کے شانہ بشانہ امن سے رہیں گے اور مکہ کے ساتھ کوئی الگ معاہدہ نہیں کریں گے۔ مدینہ کے تمام باشندوں نے عہد کیا کہ وہ حملے کی صورت میں نخلستان کا دفاع کریں گے۔ نئے دستور میں یہودی قبیلوں کو مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی البتہ یہودیوں سے یہ توقع کی گئی کہ وہ اس دستاویز سے اتفاق کرنے والے لوگوں پر حملے کی صورت میں انہیں امداد فراہم کریں گے۔ (Reza Aslan: No god but God: pp.89-90)۔ (Watt: Muhammad at Medina, pp.225-43)۔ رسول کریمؐ کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ آپؐ کا طرف دار کون ہے؟ چنانچہ معاہدے کی بعض شرطوں کو قبول نہ کرنے والے لوگ نخلستان چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں کئی حنیف بھی شامل تھے جن کی خانہ کعبہ کے ساتھ عقیدت کا تقاضا تھا کہ وہ قریش کے وفادار رہیں۔ آں حضرتؐ ابھی تک متنازع شخصیت تھے تاہم بدر میں آپؐ کی فتح کے نتیجے میں کئی خانہ بدوش قبائل مستقبل کی جدوجہد میں مدینہ کے اتحادی بننے پر رضامند ہو گئے۔

اب حضورؐ کی گھریلو زندگی میں بھی بعض تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ بدر سے واپسی پر آپؐ کو معلوم ہوا کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے شوہر حضرت عثمانؓ کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا لیکن جب انہیں پتا چلا کہ آں حضرتؐ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کی حضرت عثمانؓ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ خوش ہو گئے۔ اس طرح رسول اللہؐ سے ان کا قریبی تعلق دوبارہ بحال ہو گیا۔ جنگی قیدیوں میں آپؐ کے داماد ابوالعاص بھی شامل تھے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی اہلیہ حضرت زینبؓ نے، جو ابھی تک مکہ میں رہ رہی تھیں، اپنے شوہر کی رہائی کے لیے فدیے کی رقم

Marfat.com

اور چاندی کا وہ ہار مدینہ بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے رخصتی کے وقت انہیں پہنایا تھا۔ حضورؐ نے اس ہار کو فوراً پہچان لیا اور شدت جذبات سے آپؐ کا چہرہ مبارک زرد ہو گیا۔ آپؐ نے فدیہ لیے بغیر اس امید کے ساتھ ابوالعاص کو رہا کر دیا کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ لیکن ابوالعاص نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تاہم انہوں نے آزردگی سے رسول کریمؐ کی یہ درخواست قبول کر لی کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ اور ان کی کمسن بیٹی امامہ کو آپؐ کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے کیونکہ اب مکہ میں ان کا رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ حضورؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی شادی کے لیے بھی یہ موزوں وقت تھا چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کے ساتھ ان کی شادی کر دی اور وہ مسجد کے قریب واقع ایک مکان میں رہنے لگے۔

تقریباً اسی وقت آپؐ نے ایک اور شادی کرنے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ حال ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ وہ خوبصورت، مہذب، شائستہ اور سلیقہ مند تھیں۔ حضورؐ سے شادی کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ حضرت حفصہؓ اپنے باپ کی طرح لکھنا پڑھنا جانتی تھیں لیکن والد کی طرح تنک مزاج تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے نہایت خوشدلی کے ساتھ حضرت حفصہؓ کا خیر مقدم کیا۔ وہ حضورؐ کی دوسری ازواج مطہراتؓ سے حسد کرتی تھیں لیکن ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان موجود گہرے تعلقات کی بنا پر ان دونوں میں دوستی بڑھتی گئی۔ کمزور قوت متخیلہ رکھنے والی حضرت سودہؓ کے خلاف ان دونوں نے خاص طور پر ایکا کر رکھا تھا۔

حضرت عائشہؓ اس حجرے میں منتقل ہو گئیں جو مسجد میں ان کے لیے تعمیر کیا گیا تھا البتہ طبری نے لکھا ہے کہ کم عمر ہونے کی بنا پر انہیں کچھ دیر کے لیے اپنے والدین کے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شفیق اور مہربان شوہر تھے۔ آپؐ کو اصرار تھا کہ آپؐ کی ازواج مطہراتؓ کو اپنے مختصر اور آس پاس بنے ہوئے حجروں میں کفایت شعاری کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ لیکن آں حضرتؐ گھریلو کام کاج میں ازواج مطہراتؓ کا ہاتھ بٹاتے اور اپنے سارے کام خود کرتے۔ آپؐ اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگاتے، جوتوں کی مرمت کر لیتے اور گھر میں بکریوں کی دیکھ بھال کرتے۔

حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا آپؐ کو خاص طور پر مرغوب تھا چنانچہ بعض اوقات آپؐ ان سے دوڑ کا مقابلہ کرتے۔ حضرت عائشہؓ کوئی شرمیلی یا منکسر المزاج نہیں، ایک بیباک خاتون تھیں لیکن حضورؐ کے ساتھ انہیں بے پناہ محبت تھی۔ وہ رسول اللہؐ کے سر پر آپؐ کے پسندیدہ خوشبودار تیل کی مالش کرتیں اور دونوں ایک ہی برتن میں پانی پیتے۔ ایک دن جب دونوں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے اور آں حضرتؐ اپنی چپل کو مرمت کرنے میں مصروف تھے تو حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ کسی خیال کے زیر اثر آپؐ کا چہرہ دمکنے لگا ہے۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے آپؐ کا چہرہ مبارک دیکھا اور اس چمک دمک اور خوشی کے تاثر پر آپؐ کی تعریف و تحسین کی۔

Marfat.com

آں حضرتؐ نے اٹھ کر ان کی پیشانی کو چوم لیا اور کہا: ''اے عائشہ! اللہ تمہیں اجر دے، میں تمہیں اتنی خوشی نہیں دے پاتا جتنی خوشی تم سے مجھے ملتی ہے۔'' (Nabia Abbott: Aisha, the Beloved of Muhammad, p.67)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اہل خاندان کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے اور آپؐ کی عوامی اور نجی زندگی کے درمیان کوئی تضاد موجود نہیں تھا۔ (Mernissi: Women and Islam, pp.106-11)۔ ازواج مطہراتؓ مسجد میں بولے جانے والے ہر لفظ کو اپنے حجروں میں سن سکتی تھیں۔ مہاجرین نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ مدینہ کی عورتوں کا مزاج مختلف ہے اور مکہ کی خواتین کے مقابلے میں ان پر مردوں کا بہت کم کنٹرول ہے۔ انہیں جلد ہی پتا چل گیا کہ ان کی اپنی بیویاں مدنی عورتوں کے آزادانہ اور سہل طور طریقے اپنا رہی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی بیوی کی جب سرزنش کی گئی تو اس نے اپنا قصور ماننے کے بجائے الٹا جواب دیا اور جب حضرت عمرؓ نے اسے ڈانٹا تو اس نے صرف یہ جواب دیا کہ رسول کریمؐ نے ازواج مطہراتؓ کو بحث مباحثے کی اجازت دے رکھی ہے۔ (محمد البخاری، الصحیح: Mernissi: Women and Islam, pp 142-43: Leila Ahmad: Women and Gender in Islam, pp.52-53)۔ یہ ناخوشگوار صورت حال اس وقت پیدا ہونا شروع ہوئی جب رسول اللہؐ نے نجی اور عوامی زندگی کو قصداً یک جا کیا اور آپؐ کے اس اقدام سے مردوں کی اس بالادستی کو شدید دھچکا لگا جو صرف اس امتیاز کو برقرار رکھنے کی صورت میں ہی موجود رہ سکتی ہے۔

فتح کا جوش و خروش ماند پڑنے کے بعد نبی کریمؐ نے محسوس کیا کہ اگرچہ عرب میں مجموعی طور پر آپؐ کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو گیا ہے، اس کے باوجود مکہ کے ناگزیر حملے کے خطرے سے مدینہ میں اپوزیشن پارٹی کو تقویت مل رہی ہے۔ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کو یہودیوں کے تین قبیلوں بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کی حمایت حاصل تھی جن کا دارومدار قریش کے ساتھ تجارت پر تھا لہٰذا وہ مکہ کے خلاف جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی دوران نخلستان میں ایک تیسرا طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ معرکہ بدر کے کوئی دس ہفتے بعد ابوسفیان مدینہ والوں کو مستقبل میں پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے دو سو سواروں کا دستہ لے کر مدینہ کے ایک پہاڑ کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ پھر وہ راتوں رات نکل کر اندھیرے میں یہودی قبیلے بنو نضیر کے پاس گیا جہاں قبیلے کے سردار سلام بن مشکن نے ابوسفیان کی میزبانی کی اور کھلایا پلایا۔ اس نے ابوسفیان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور محمد ابن اسحاق کے مطابق اسے مسلمانوں کے رازوں کی خبر دی۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۴۳)۔

رسول اللہؐ کے جاسوس آپؐ کو تازہ ترین صورت حال سے مکمل طور پر باخبر رکھتے۔ یہودیوں کے تینوں قبیلے سیکورٹی رسک تھے، ان کے پاس اپنی فوجیں اور تجربہ کار سپاہی موجود تھے۔ اگر مکہ کی فوج مدینہ کے

Marfat.com

جنوب میں پڑاؤ ڈالتی ہے جو بنونضیر اور بنوقریظہ کے علاقے تھے تو اس صورت میں وہ آسانی سے قریش کی فوج کے ساتھ جا ملتے اور مدینہ کے دفاع میں رخنہ پڑ جاتا۔ اگر قریش شمال کی طرف سے مدینہ پر حملہ آور ہوتے جو ان کا بہترین آپشن تھا تو بنونضیر اور بنوقریظہ جنوب کی سمت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیتے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرہ بنوقینقاع سے تھا جو یہودیوں کا سب سے امیر قبیلہ اور ابن ابی کا سابق اتحادی تھا۔ مدینہ کے وسط میں واقع منڈی کو بھی یہی قبیلہ کنٹرول کرتا تھا۔

(Aslan: No god but God, pp.89-90,

Lings: Muhammad, pp.160-62, Andrae: Muhammad, p.207,

Watt: Muhammad at Medina, pp.190-210)

مسلمانوں نے خود ایک چھوٹی سی مارکیٹ قائم کر لی تھی اور مذہبی تعلیمات کی بنا پر وہ کوئی سود نہیں لیتے تھے۔ بنوقینقاع نے مسلمانوں کے اس اقدام کو براہ راست چیلنج تصور کیا اور رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدے کو توڑتے ہوئے اپوزیشن میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ حضورؐ نے اس یہودی قبیلے کے علاقے میں جا کر مشترک مذہب کی بنیاد پر ان سے کہا کہ وہ امن برقرار رکھیں۔ یہود نے باغیانہ خاموشی سے آپؐ کی باتیں سنیں اور پھر کہنے لگے:

''اے محمدؐ! تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم کی طرح ہیں۔ تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تم نے ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا جنہیں جنگ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اس لیے ان پر قابو پا لیا۔ واللہ! اگر ہم سے جنگ کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ہم خاص قسم کے لوگ ہیں اور آپؐ کو ہم سا کوئی نہیں ملا۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۴۵: The Life of Muhammad, p.363)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) افسردہ ہو کر واپس آ گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔

چند روز کے بعد ایک یہودی سنار نے بنوقینقاع کے بازار میں ایک مسلمان عورت کی توہین کی جس کے بعد یہودیوں اور مسلمانوں میں لڑائی ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد حضورؐ کو ثالث (حکم) کے طور پر وہاں بلایا گیا لیکن بنوقینقاع کے سرداروں نے آپؐ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا، اپنے قلعے میں بند ہو گئے اور عرب حلیفوں سے امداد کی درخواست کر دی۔ بنوقینقاع کے پاس سات سو کی نفری پر مشتمل اپنی فوج تھی اور اگر ان کے اتحادی امداد کے لیے پہنچ جاتے تو وہ مسلمانوں کو یقیناً شکست دے دیتے اور غالباً امت کا صفایا کر دیتے۔ لیکن عربوں نے پورے استقلال کے ساتھ رسول کریمؐ کی حمایت کی اور ابن ابی کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ پوری طرح بے بس ہے اور پرانے اتحادیوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ دو ہفتے کے محاصرے کے بعد بنوقینقاع غیر مشروط

Marfat.com

طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ غداروں کو دی جانے والی روایتی سزا یہ تھی کہ رسول اللہؐ یہودی مردوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیتے لیکن حضورؐ نے ابن ابی کی درخواست پر ان یہودیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا بشرطیکہ پورا قبیلہ مدینہ سے فوری طور پر چلا جائے۔ بنو قینقاع نخلستان کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے ایک جوا کھیلا تھا جس میں وہ اس لیے ہار گئے تھے کیونکہ انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی نئی مقبولیت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس پر ان کے عرب اتحادیوں اور دوسرے یہودی قبیلوں نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ ہجرت سے پہلے ہلاکت خیز جنگوں کے دوران قبیلوں کو نخلستان سے نکال دیا جاتا تھا چنانچہ یہود کا اخراج اس عمل کا ایک حصہ تھا جو آں حضرتؐ کی مدینہ آمد سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ (M.J.Kister: Al-Hira)۔ اس موقعے پر خوں ریزی سے گریز کیا گیا لیکن حضورؐ ایک المناک اخلاقی کشمکش سے دوچار تھے۔ قریش کے خلاف جہاد کا جواز یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو ان کے آبائی شہر سے نکال باہر کیا تھا جس کی قرآن مجید نے بھی مذمت کی تھی اور اسے ایک بہت بڑی برائی سے تعبیر کیا تھا۔ اب آپؐ عربوں کی جارحانہ روایات میں پھنس کر ایک اور قوم کو اس کی آبائی سرزمین سے نکال باہر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مدینہ کے لوگ مکہ کے ناگزیر حملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ ابوجہل بدر کے میدان میں مارا گیا تھا اور ابولہب بھی انتقال کر چکا تھا اس لیے اب ابوسفیان قریش کا سب سے بڑا سردار اور اسلام کا سخت دشمن بن گیا۔ موسم گرما کے آخر میں مسلمان غازیوں کے ایک دستے نے مکہ کے ایک بڑے تجارتی کارواں کو پکڑ لیا۔ اگر ابوجہل زندہ ہوتا تو فوری طور پر جوابی کارروائی کرتا لیکن ابوسفیان نے اپنی شکست کو طویل المیعاد مقاصد کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا، اس نے اپنی تیاریاں تیز کر دیں اور بدوی قبیلوں کا وسیع تر اتحاد تشکیل دینے میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ سردیاں ختم ہوتے ہی ۱۱ مارچ ۶۲۵ عیسوی کو تین ہزار آدمیوں کی فوج تین ہزار اونٹوں اور دو سو گھوڑوں کے ہمراہ مدینہ پر چڑھائی کے لیے نکل پڑی۔ آخر اس فوج نے مدینہ کے شمال میں احد پہاڑ کے سامنے میدان میں خیمے لگا لیے۔

(Lings: Muhammad , pp.170-97: Andrae: Muhammad, pp210-213)

(Watt: Muhammad at Medina: pp.20-30)

مدینہ کے مسلمانوں کو قریش کی پیش قدمی کی خبر صرف ایک ہفتہ پہلے ملی۔ کھیتوں سے فصل اٹھانے کے لیے وقت میسر نہیں تھا البتہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دوسرے سردار مضافات کے لوگوں کو مدینہ لانے میں کامیاب ہو گئے اور انہیں عجلت میں ''شہر'' میں مورچہ بند کر دیا گیا۔ آزمودہ کار جنگجوؤں نے محتاط طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ عرب میں محاصرہ جاری رکھنا بہت مشکل تھا چنانچہ ان تجربہ کار افراد

Marfat.com

نے تجویز کیا کہ سب لوگ مدینے کے اندر رہیں اور قریش کے ساتھ لڑائی نہ کریں۔ اس طرح قریش خود پسپا ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن بدر کی فتح کے بعد نئی نسل جنگ کرنا چاہتی تھی لہٰذا انہوں نے قریش کا مدینہ سے باہر مقابلہ کرنے کی تجویز پیش کر دی اور رسول کریمؐ کو، جو سپریم کمانڈر نہیں تھے، نوجوانوں کا یہ تباہ کن فیصلہ ماننا پڑا۔ بڑے یہودی قبیلوں نے جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور ابن ابی فوج میں شامل اپنے آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ غرض اگلی صبح حضورؐ کو انتہائی مختصر فوج کے ساتھ قریش کی تین گنا فوج کے سامنے صف آرا ہونا پڑا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ قریش کے لشکر کے پیچھے ابوسفیان کی بیوی ہند کئی دوسری عالی نسب عورتوں کے ساتھ دف بجا بجا کر اور جنگی ترانے گا گا کر مردوں کو ابھارنے لگی۔ قریش کے گھڑسوار دستے نے اس شدت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ آں حضرتؐ بے ہوش ہو گئے اور یہ افواہ پھیل گئی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ پر صرف بے ہوشی طاری ہوئی تھی لیکن قریش نے اس افواہ کی تصدیق نہ کی اور اپنی کامیابی سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مسلم سپاہ منظم انداز میں پسپا ہو گئی۔ اس لڑائی میں مکہ کے ۲۲ افراد ہلاک اور رسول اللہؐ کے نامور جنگجو چچا حضرت حمزہؓ سمیت ۶۵ مسلمان شہید ہوئے۔ قریش نے میدان جنگ پر دھاوا بول دیا اور شہدا کی لاشوں کو مسخ کرنے لگے۔ ایک قریشی نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکالا اور اسے ہند کے پاس لے گیا جس نے کلیجہ چبا کر بدر میں حمزہؓ کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے بھائی کا انتقام لینے کی قسم پوری کر لی۔ اس کے بعد ہند نے حضرت حمزہؓ کا ناک، کان اور دوسرے اعضا کاٹ کر ہار اور پازیب بنا لیے۔ اس نے قریش کی دوسری عورتوں سے کہا کہ وہ بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں۔ یہ عورتیں ہار، بندے اور پازیب پہنے میدان جنگ سے رخصت ہوئیں تو قریش کے بدو اتحادی انہیں دیکھ کر سخت متنفر ہو گئے۔ بدر سے واپسی سے پہلے ابوسفیان نے یہ مایوس کن خبر سن لی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زندہ ہیں۔ ''ہاں!'' ایک مسلمان نے رسول عربیؐ کی طرف سے بلند آواز میں چلا کر کہا: ''اگلے سال میدان بدر میں ہماری تمہاری پھر جنگ مقرر ہے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۸۳: The Life of Muhammad, p.386)۔

مسلمانوں کو اس سے بھی بدتر شکست دی جا سکتی تھی۔ اگر قریش ان کا تعاقب جاری رکھتے تو امت مسلمہ کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن احد کا نفسیاتی اثر اس سے بھی تباہ کن تھا۔ لڑائی کے بعد جب آں حضرتؐ دل گیر اور افسردہ حالت میں واپس مدینہ آئے تو آپؐ نے مسجد کے باہر آہ و زاری اور گریے کی آوازیں سنیں۔ یہ ان انصار کی بیویاں تھیں جو احد میں شہید ہو گئے تھے۔ ابن ابی نے جنگ میں حصہ لینے سے جو انکار کیا تھا، مسلمانوں نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا۔ اگلے جمعے کو جب وہ مسجد میں تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو ایک انصاری اس پر

Marfat.com

جھپٹ پڑا اور اسے بتایا کہ احد میں غداری کے بعد وہ اپنا منہ بند رکھے۔ اس پر ابن ابی غضب ناک ہو کر مسجد سے نکل گیا اور حضورؐ سے معافی طلب کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ جنگ احد کے بعد قرآن حکیم نے ابن ابی کی جماعت کو ایک نیا نام دے دیا اور اس کے پیروکاروں کو منافقین کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ منافقین یہ انتظار کرنے لگے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اب ان کا رویہ کھلے عام جارحانہ ہو گیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ بدر میں رسول اللہؐ کی فتح محض باسی کڑھی میں ابال تھا اور یہ کہ آپؐ مدینہ کے لیے موت اور تباہی لائے ہیں۔

احد میں شہید ہونے والے ہر مسلمان کے پسماندگان میں بیویاں اور بیٹیاں شامل تھیں اور ان کا کوئی محافظ نہیں تھا۔ چنانچہ شکست کے بعد حضورؐ پر ایک وحی نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا نے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اس لیے اس کی نظروں میں دونوں جنسیں مساوی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور پاک اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو، اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر نہ کھا جاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے۔ لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور ایک طرف جھک پڑنے سے بچ جاؤ۔ (سورہ نسا: آیات ۲، ۳)۔

مسلمانوں میں کثیر الازدواجی کی اجازت پر بہت نکتہ چینی کی جاتی ہے اور اسے مسلم خواتین کے مصائب کا ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے لیکن جب یہ وحی نازل ہوئی، اس وقت اسے سماجی پیش رفت قرار دیا جاتا تھا۔

(Watt: Muhammad at Medina, pp.272-83, 289-93: Ahmad: Women and Gender in Islam, pp.43-44, 52)

اسلام سے پہلے کے دور میں ہر مرد اور عورت کو کئی کئی شادیوں کی اجازت تھی۔ عورت اپنے خاندان میں رہتی اور اس کے تمام ''شوہر'' اس کے پاس آتے۔ اصل میں یہ لائسنس یافتہ عصمت فروشی تھی۔ ان حالات میں پدری رشتہ یقینی نہیں تھا چنانچہ بچوں کو عام طور پر اپنی ماؤں کے نام سے شناخت کیا جاتا تھا۔ مرد عورتوں کے نان و نفقے کے ذمے دار نہیں تھے اور نہ ہی وہ اپنی اولاد کی کفالت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت عرب ایک عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ جزیرہ نما میں اس نئے نظریے کا کہ افراد کو فکر و عمل کی آزادی ہونی چاہیے، مطلب یہ تھا کہ

Marfat.com

مرد اپنے بچوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے، وہ ذاتی املاک کا زیادہ حق جتانے لگے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کی دولت ان کے بیٹوں کو ورثے میں ملے۔ قرآن کریم نے متحدہ خاندانوں پر مشتمل معاشرہ قائم کرنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی۔ خود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کئی شادیاں کیں اور ازواج مطہراتؓ کو نان ونفقہ فراہم کیا۔ قرآن پاک میں مسلمانوں کو کثیر الازدواجی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ قرآن اس سماجی مسئلے سے بھی بخوبی آگاہ تھا جو ان نئی آیات کے نزول کے بعد پیدا ہونے والا تھا۔

ظہور اسلام سے پہلے کوئی عورت جائیداد کی مالکہ نہ ہوتی۔ اس کی دولت اس کے خاندان کی ملکیت ہوتی اور اس کے مرد رشتے دار اس کا انتظام وانصرام کرتے۔ لیکن مکہ میں، جہاں عرب کے کسی بھی علاقے کے مقابلے میں انفرادیت کے نظریے پر زیادہ عمل کیا جاتا، اشراف خاندانوں کی کئی خواتین کو وراثت میں جائیداد ملتی اور وہ خود اس کا انتظام چلاتیں۔ اس سلسلے میں جناب خدیجہؓ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے تاہم مکہ میں ایسی بہت کم مثالیں موجود تھیں اور مدینہ میں تو کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔ بیشتر مرد اس نظریے کو ہی مضحکہ خیز سمجھتے تھے کہ عورتوں کو وراثت مل سکتی ہے اور وہ اپنی جائیداد کی خود دیکھ بھال کرسکتی ہیں۔ عورتوں کے لیے کوئی انفرادی حقوق نہیں تھے۔ وہ ان حقوق کو حاصل بھی کیسے کرسکتی تھیں؟ چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر معیشت میں خواتین کا کوئی رول نہیں تھا اور چونکہ وہ غزووں میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں اس لیے وہ اپنی برادری کے لیے کوئی دولت نہ لاتیں۔ خواتین کو روایتی طور پر مردوں کی جائیداد سمجھا جاتا تھا۔ مرد کی وفات کے بعد اس کی بیواؤں اور بیٹیوں کو مرد وارثوں کے حوالے کردیا جاتا جو ان کو وراثت میں ملنے والی جائیداد کو ہتھیانے کے لیے انہیں عموماً بے بیاہتا اور تنگ دست رکھتے۔

کثیر الازدواجی کے متعلق قرآنی احکام کو سماجی قانون کا درجہ حاصل تھا جس کا مقصد مردوں کی جنسی تسکین کا سامان کرنا نہیں، بیواؤں، یتیموں اور دوسری زیر کفالت اور بے کس خواتین کے ساتھ روا رکھی جانے والی بے انصافی کا ازالہ کرنا تھا کیونکہ غیر محتاط لوگ عموماً ہر چیز پر قبضہ کرلیتے اور خاندان کے کمزور افراد کے لیے کچھ نہ چھوڑتے۔ (Mernissi: Women and Islam, pp.123, 182)۔ مرد گارڈین انہیں اکثر جنسی تشدد کا نشانہ بناتے یا انہیں لونڈیاں بنا کر بیچ ڈالتے اور اس طرح انہیں مالیاتی اثاثے میں تبدیل کردیتے۔ مثال کے طور پر ابن ابی اپنی لونڈیوں سے جبراً عصمت فروشی کروا کر دولت اکٹھی کرتا۔ قرآن مجید میں ایسے طرز عمل کی شدید مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو وراثت کے ناقابل منتقلی حقوق دیے گئے ہیں۔ کثیر الازدواجی کی اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اجازت دی گئی تھی کہ غیر محفوظ عورتوں کی احسن طریقے سے شادی کردی جائے اور قدیم ڈھیلے ڈھالے، غیر ذمے دارانہ ناجائز تعلقات کو ختم کرکے مرد کو صرف چار بیویاں رکھنے کی

Marfat.com

اجازت دی جائے۔لیکن مرد پر یہ فرض عاید کر دیا گیا کہ وہ تمام بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔عورتوں کی املاک کو ہڑپ کرنے کو بھی غیر منصفانہ اور ظالمانہ فعل قرار دیا گیا۔

قرآن کریم خواتین کو وہ قانونی حقوق دینے کی کوشش کر رہا تھا جو مغرب کی عورتوں کو انیسویں صدی تک نہیں ملے۔عورتوں کی نجات اور قانونی یا اخلاقی مجبوریوں سے آزادی رسول کریمؐ کو دل سے عزیز تھی لیکن آپؐ کے بعض انتہائی قریبی صحابہؓ سمیت امت کے کئی مرد اس منصوبے کے خلاف تھے۔جس معاشرے میں تنگی اور قلت کا مسئلہ درپیش ہو، وہاں چار بیویاں اور ان کے بچوں کی کفالت کا بوجھ قبول کرنے کے لیے جرأت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔مسلمان اس یقین سے سرشار ہونے چاہییں کہ خدا انہیں روزی کا سامان فراہم کرے گا۔

اور ان لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کا مقدور نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار بنا دے۔تمہارے غلاموں میں سے جو کوئی کچھ تمہیں دے کر آزادی کی تحریر کرانا چاہے تو تم ایسی تحریر انہیں کر دیا کرو اگر تم کو ان میں کوئی بھلائی نظر آتی ہو اور اللہ نے جو مال تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں بھی دو، تمہاری جو لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انہیں دنیا کی زندگی کے فائدے کی غرض سے مجبور نہ کرو اور جو انہیں مجبور کر دے تو اللہ تعالیٰ ان پر جبر کے بعد بخش دینے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔(سورہ النور آیت ۳۳۔مترجم)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس معاملے میں بھی قافلہ سالار ثابت ہوئے۔غزوہ احد کے بعد حضورؐ نے حضرت زینبؓ بنت خزیمہ سے شادی کر کے انہیں رہنے کے لیے ایک الگ مکان دیا۔ان کے شوہر بدر کے معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔حضرت زینبؓ بدوی قبیلے بنو عامر کے سردار کی بیٹی تھیں چنانچہ اس شادی کے نتیجے میں اس قبیلے کے ساتھ آپؐ کا نیا سیاسی اتحاد قائم ہو گیا۔ان کے لیے مسجد نبوی کے ساتھ ایک حجرہ تعمیر کیا گیا اور وہ اپنی تین بہنوں سودہؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ کے ساتھ رہنے لگیں۔

رسول اللہؐ خواتین کو مال منقولہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ازواج مطہراتؓ مردوں کی طرح آپؐ کی ''ساتھی'' تھیں۔آپؐ عموماً ایک زوجہ محترمہ کو عسکری مہم پر اپنے ساتھ لے جاتے اور آپؐ کے سپہ سالاروں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی کہ آپؐ ہر شام ان کے خیمے میں گزارتے۔لشکر گاہ میں خواتین عجز و انکسار کے ساتھ تنہا نہ رہتیں بلکہ آزادانہ گھومتی پھرتیں اور حالات و واقعات میں پوری دلچسپی لیتیں۔اسلام سے پہلے کے عرب میں اشراف طبقے کی خواتین کو بھی اس قسم کی آزادی حاصل تھی لیکن حضرت عمرؓ اس صورت حال سے مشتعل ہو جاتے۔''تمہاری یہ دلیری سرکشی کے مترادف ہے۔'' انہوں نے ایک دن حضرت عائشہؓ کو اگلے مورچوں پر چہل قدمی کرتے دیکھ کر چلاتے

Marfat.com

ہوئے کہا: ''اگر کوئی مصیبت آ گئی تو کیا ہوگا؟ اگر ہم شکست کھا گئے اور لوگوں کو قیدی بنالیا گیا تو کیا بنے گا؟''

(Mernissi: Women and Islam, pp.162-63: Ahmad: Women and Gender in Islam: p.53)

نبی کریمؐ کے گھریلو انتظامات کے باعث ازواج مطہراتؓ کو سیاست تک رسائی مل گئی اور اس شعبے میں بھی ان کا عمل دخل بڑھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ملت کی دوسری عورتوں کو بھی اسی قسم کے اختیارات مل گئے اور حضورؐ کے دشمنوں نے خواتین کی نقل وحرکت کو آں حضرتؐ کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

احد میں رسول کریمؐ کے وقار کو جو ٹھیس پہنچی، آپؐ کو اس کا ازالہ کرنا تھا۔ آپؐ قریش کے ساتھ ایک اور کھلی محاذ آرائی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپؐ اپنی کوئی کمزوری بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ۶۲۵ عیسوی کے موسم گرما میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے اندازہ ہو گیا کہ آپؐ کس قدر کمزور اور غیر محفوظ تھے۔ مدینہ کے مغرب میں واقع نجد کے علاقے کے دو بدو قبائل نے آپؐ سے درخواست کی کہ انہیں اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرانے کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنے چھ قابل ترین اشخاص کو اس مشن پر روانہ کر دیا۔ سفر کے دوران ہذیل قبیلے کے ایک سردار نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا جس میں تین مسلمان شہید ہو گئے اور باقی تین کو قیدی بنالیا گیا۔ ایک مسلمان قیدی کو، جب وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، سنگسار کر دیا گیا جب کہ دوسرے دو قیدیوں کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا اور بعد میں انہیں بھی تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

تقریباً اسی وقت قبیلہ بنو عامر کے سردار اور حضورؐ کے نئے سسر ابو براؓ نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قبیلے کے متحارب گروپوں کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ اس پر آپؐ نے چالیس مسلمانوں کو روانہ کر دیا لیکن بنو سلیم کے لوگوں نے بنو عامر کے علاقے کے باہر تقریباً تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ جب باقی بچنے والے ایک مسلمان نے دو عامریوں کو ایک درخت کے نیچے آرام سے سوتے دیکھا تو اس نے انہیں یہ سمجھ کر بدلہ لینے کے لیے قتل کر دیا کہ اس کے ساتھیوں کو ان کے قبیلے والوں نے ہلاک کیا ہے۔ جب یہ صحابیؓ مدینہ لوٹا تو حضورؐ نے اسے بتایا کہ اس نے غلط کام کیا ہے۔ لیکن عرب میں انتقام لینے کی روایت کی جڑیں اس قدر دور تک سرایت کر گئی تھیں کہ اسے ختم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ رسول کریمؐ نے ابو براؓ کو معمول کے مطابق مقتولین کا خون بہا ادا کرنے کی پیش کش کر دی حالانکہ فنی نقطہ نظر سے صحابہ کرامؓ کو بنو سلیم کے لوگوں نے قتل کیا تھا۔ حضورؐ کو توقع تھی کہ اگر ابو براؓ کو خون بہا دے دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان کا پورا قبیلہ اسلام قبول کر لے گا۔ اس حسن سلوک کی بنا پر آپؐ کے کئی پرانے دشمن ملت اسلامیہ کے بارے میں زیادہ ہمدردی سے سوچنے لگے

Marfat.com

یہاں تک کہ بنوسلیم کے جن لوگوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا، شہادت کے وقت صحابہؓ کے پختہ ایمان اور جرأت مندی کے مظاہرے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ خود بھی ایمان لے آئے۔

مدینہ میں رسول کریمؐ کی پوزیشن غیر محفوظ رہی اور آپؐ اپنے محافظوں کو موقوف کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جب آپؐ نے مقتول عامریوں کا خون بہا اکٹھا کرنے کے لیے بنونضیر سے ملاقات کی تو انہوں نے آپؐ پر قاتلانہ حملہ کر دیا تاہم اس حملے میں آپؐ بال بال بچ گئے۔ اس واقعے میں بنونضیر کے بعض یہودیوں نے ایک مکان کی چھت سے پتھر گرا کر حضورؐ کو شہید کرنے کی کوشش کی تھی۔ ابن ابی نے یہودیوں کو امداد دینے کا وعدہ کیا تھا اور غالباً یہود نے بھی یہ اندازہ لگایا کہ احد کے بعد مدینہ کے عرب قبائل رسول کریمؐ کی حمایت سے سبکدوش ہو کر ان کی امداد کرنے لگیں گے۔ چنانچہ جب انہیں اپنے سابق اتحادی قبیلے اوس کی طرف سے یہ درشت پیغام ملا کہ چونکہ یہود نے رسول خداؐ کے ساتھ معاہدہ توڑ دیا ہے اس لیے اب وہ مدینہ میں نہیں رہ سکتے تو یہودیوں کو اس پیغام پر سخت حیرت ہوئی۔

بنوقینقاع کی طرح بنونضیر بھی اپنے قلعے میں مورچہ بند ہو کر اپنے اتحادیوں کا انتظار کرنے لگے لیکن اس مرتبہ بھی کوئی امداد نہ پہنچی یہاں تک کہ حضورؐ کی مخالفت کرنے والے طاقتور یہودی قبیلے بنوقریظہ نے بھی انہیں بتا دیا کہ وہ ان سے امداد کی توقع نہ رکھیں۔ دو ہفتوں کے بعد بنونضیر کو معلوم ہو گیا کہ وہ زیادہ عرصے تک قلعہ بند نہیں رہ سکتے۔ اور جب رسول اللہؐ نے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹنے کا حکم دے دیا، جو عرب میں جنگ کی واضح علامت تھی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صرف یہ درخواست کی کہ ان کی جانیں بخش دی جائیں۔ آں حضرتؐ نے اس شرط پر ان کی درخواست قبول کر لی کہ وہ نخلستان کو فوری طور پر چھوڑ دیں اور صرف وہی مال و اسباب ساتھ لے جائیں جنہیں ان کے اونٹ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودی اپنی تمام املاک کو ساتھ لے گئے یہاں تک کہ انہوں نے دروازوں کی چوکھٹوں تک کو توڑ دیا تاکہ وہ آں حضرتؐ کے کام نہ آ سکیں۔ یہودی بڑے طمطراق کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے جیسے انہوں نے کوئی علاقہ فتح کر لیا ہو۔ ان کی عورتوں نے زرق برق لباس اور زیورات پہن رکھے تھے اور وہ طبل اور ڈھول بجاتی اور گاتی ہوئی مدینے سے نکلیں۔ یہ لوگ نخلستان کے باغوں اور بستیوں سے گزرتے ہوئے آخر کار شام جانے والی شاہراہ پر چل پڑے۔ ان میں سے بعض لوگ یہود کی قریبی بستی خیبر میں رک گئے جہاں وہ شمالی قبیلوں کو اکٹھا کر کے مسلمانوں کے خلاف ابوسفیان کے اتحاد میں شامل ہو گئے۔

(Lings: Muhammad, pp.203-4)

(Watt: Muhammad at Medina, pp.185,211-17:)

(Aslan: No god but God, pp.90-91)

(Bamyeh: Social Origins of Islam, pp.201-2)

Marfat.com

رسول خداؐ نے دو سال کی مختصر مدت میں دو طاقتور قبیلوں کو مدینہ سے نکال دیا تھا اور اب مسلمان بنوقینقاع کی خالی کی ہوئی منڈی میں کاروبار کرنے لگے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حضورؐ کا یہ ارادہ نہ تھا۔ آپؐ تشدد اور بے دخلیوں کا سلسلہ بند کرنا چاہتے تھے، اسے جاری رکھنا آپؐ کا منشا نہ تھا۔ آپؐ نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ آپؐ اب بھی مخالفوں کا حساب چکا سکتے ہیں۔ اس قسم کی کامیابی اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے بے سود ثابت ہوئی کیونکہ بنونضیر خیبر میں بھی مسلمانوں کے لیے مسلسل خطرہ بنے رہے۔

ابوسفیان نے احد سے روانگی کے وقت ''اگلے سال بدر میں'' کا جو نعرہ لگایا تھا، اب اس کا مناسب جواب دینے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک خطرناک کھیل کھیل رہے تھے۔ آپؐ کو طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا لیکن آپؐ کے فوجی دستے اس قدر دل شکستہ ہو چکے تھے کہ اب ایک اور خوں ریز جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے بدر کے سالانہ میلے (سوق) کے دوران پندرہ سو مسلمانوں کا دستہ لے کر بدر کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ خوش قسمتی سے ابوسفیان وہاں نہ پہنچا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ حضورؐ وعدے کے مطابق بدر پہنچ جائیں گے۔ وہ محض دکھاوے کے لیے فوج کو لے کر مکہ سے روانہ ہوا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی کہ رسولؐ خدا مدینے سے روانہ نہیں ہوئے، وہ اپنی فوج کو واپس مکہ لے آئے گا۔ اس سال شدید قحط پڑا تھا اور سفر کے دوران اونٹوں کے لیے گھاس کا ایک تنکا بھی دستیاب نہیں تھا۔ ابوسفیان کے پاس صرف چند دن کے لیے رسد تھی اور جب وہ ختم ہوگئی تو اسے اپنی فوج کو مکہ لانا پڑا۔ اس پر اہل مکہ نے اس کی سخت سرزنش کی کیونکہ بدو قبائل نے مسلمانوں کی بڑی تعریف کی کہ وہ بڑے بہادر ہیں۔ (Lings: Muhammad , pp 207-8)۔

مدینہ میں آں حضرتؐ کی پوزیشن اب بھی کمزور تھی۔ (بڑی پختگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ آپؐ کا حکم ہوتے ہی نکل کھڑے ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمہاری) اطاعت (کی حقیقت) معلوم ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ سورہ النور آیت ۵۳۔ مترجم۔ اب آپؐ ان کا خیال چھوڑ دیں اور منتظر رہیں۔ یہ بھی منتظر ہیں، سورہ السجدہ آیت ۳۰۔ مترجم)۔ لیکن جزیرہ نما میں مجموعی طور پر ہوا کا رخ آپؐ کے حق میں تبدیل ہو رہا تھا۔ آپؐ جب بھی یہ سنتے کہ کوئی بدوی قبیلہ مکی اتحاد میں شامل ہوگیا ہے تو آپؐ اس قبیلے کے خلاف مہم کی قیادت کرتے اور ان کی بھیڑ بکریوں کے گلے اور ریوڑ کو پکڑ لیتے خواہ اس کے لیے آپؐ کو شام کی سرحد تک پانچ سو میل کا سفر ہی کیوں نہ طے کرنا پڑتا۔ جون ۶۲۶ عیسوی میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ بدوی قبیلے غطفان کے بعض لوگ مدینہ پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں چنانچہ ذات الرقاع کے مقام پر خانہ بدوشوں کے ساتھ آپؐ کی مڈبھیڑ ہوگئی لیکن آپؐ نے ایک مرتبہ پھر براہ راست

Marfat.com

تصادم سے گریز کیا۔ مسلمان تین دن تک دشمن کے مقابل صف آرا رہے۔ طبری اور محمد ابن اسحاق دونوں نے واضح کیا ہے کہ اس موقعے پر گو جنگ کی نوبت نہ آئی مگر ایک دوسرے سے خوف و اندیشہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے مطابق صلوٰۃ خوف ادا کرنا پڑی۔ (جب تم ان میں ہو اور ان کے لیے نماز کھڑی کرو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار تیار لیے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آ جائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی، وہ آ جائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہے، کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں، ہاں اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمہیں تکلیف ہو یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لیے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے منکروں کے لیے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے۔ سورہ النسا آیت ۱۰۲۔ مترجم)۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مقررہ وقت پر اجتماعی نماز ادا کرتے وقت ہتھیار رکھ کر دشمن کے سامنے کمزوری نہ دکھائیں بلکہ باری باری نماز پڑھیں اور اپنے ہتھیاروں کو تیار رکھیں۔ آخر جنگ کا خطرہ ٹل گیا، بنو غطفان کے لوگ واپس چلے گئے اور حضورؐ بھی ایک علامتی فتح حاصل کرنے کے بعد مدینہ لوٹ گئے۔

صلوٰۃ خوف کے حکم سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیا دین اسلام کس قدر نرغے اور مدافعانہ حالت میں تھا۔ ہمیں مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات سے قرآن حکیم کی بظاہر پسپائی کا اسی پس منظر میں جائزہ لینا چاہیے۔

جنوری ۶۲۶ عیسوی میں آپؐ کی نئی زوجہ محترمہ حضرت زینبؓ شادی کے صرف آٹھ ماہ بعد وفات پا گئیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد آپؐ نے غزوہ احد کے بعد وفات پا جانے والے اپنے پھوپھی زاد ابوسلمہ کی بیوہ ہند بنت ابی امیہ کو شادی کی پیش کش کی۔ ان کے چار بچے تھے۔ ہند یا ام سلمہؓ کے نام سے مشہور اس خاتون کی عمر ۲۹ برس تھی۔ وہ ایک خوبصورت، مہذب اور بے حد ذہین خاتون تھیں۔ جناب خدیجہؓ کی طرح وہ بھی حضورؐ کی بہترین رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ وہ مکہ کے انتہائی طاقتور قبیلے بنی مخزوم کے ایک سرکردہ شخص کی بہن تھیں۔ لیکن شروع میں وہ آں حضرتؐ کے ساتھ شادی کرنے میں متذبذب تھیں۔ انہیں اپنے مرحوم شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے واضح کیا کہ اب وہ جوان نہیں رہیں اور ان کی طبیعت میں رشک اور حسد بھی پایا جاتا ہے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ حرم میں زندگی گزار سکیں گی۔ یہ سن کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہنس پڑے۔ آپؐ کا دلفریب تبسم دلوں کو موہ لیتا۔ حضورؐ نے انہیں یقین دلایا کہ آپؐ ان سے بھی زیادہ عمر کے ہیں اور یہ کہ خدا انہیں حسد سے محفوظ رکھے گا۔

Marfat.com

حضرت ام سلمہؓ کے اندیشے درست تھے کیونکہ مسجد میں زندگی کوئی آسان نہیں تھی۔

(Lings: Muhammad, pp.211-12)

(Mernissi: Women and Islam, pp.153-4, 172)

رسول اللہؐ کی ازواج مطہراتؓ کے حجرے اس قدر چھوٹے تھے کہ ان کے اندر سیدھے کھڑا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ خود حضورؐ کا اپنا کوئی حجرہ نہیں تھا۔ آپؐ باری باری ازواج مطہراتؓ کے پاس جاتے اور اس دن وہی حجرہ آپؐ کی سرکاری رہائش گاہ ہوتا۔ عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہاں خلوت یا تنہائی کا کوئی وجود نہیں تھا کیونکہ آپؐ ہمیشہ لوگوں کے ہجوم اور نرغے میں رہتے۔ آپؐ کی صاحبزادیاں اور نواسے نواسیاںؓ اکثر آپؐ کے پاس آتے۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے آپؐ کو دلی لگاؤ تھا۔ آپؐ کو اپنی ننھی نواسی امامہؓ کے ساتھ خاص طور پر بڑی محبت تھی جسے کندھوں پر بٹھا کر آپ مسجد میں چلے جاتے۔ حضورؐ اپنے قریبی صحابہ ابوبکرؓ، زیدؓ، علیؓ، عثمانؓ اور سب سے بڑھ کر عمرؓ کے ساتھ مسلسل ملاقاتیں کرتے۔ جب عرب میں آپؐ کی عزت اور توقیر میں اور اضافہ ہو گیا تو آپؐ خانہ بدوش قبیلوں کے ان وفدوں سے بھی ملاقات کرتے جو اپنے اونٹوں کے ساتھ صحن مسجد میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔

رسول کریمؐ نماز پڑھنے کے بعد جب مسجد سے روانہ ہوتے تو اپنی اپنی معروضات پیش کرنے والوں کا جم غفیر آپؐ کو گھیرے میں لے لیتا۔ لوگ آپؐ کے کپڑے کھینچتے اور چیختے چلاتے ہوئے آپؐ سے سوال اور مطالبے کرتے۔ (اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز میں بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ آپؐ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں اکثر (بالکل) بے عقل ہیں۔ اگر یہ لوگ یہاں تک صبر کرتے کہ آپؐ خود سے نکل کر ان کے پاس آ جاتے تو یہی ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ سورہ الحجرات آیات ۲، ۴، ۵۔ مترجم)۔ یہ لوگ آپؐ کے پیچھے چلتے ہوئے ازواج مطہراتؓ کے حجروں میں پہنچ جاتے اور دسترخواں پر اس قدر ہجوم کر دیتے کہ آپؐ کے لیے کھانے کا ایک نوالہ تک لینا مشکل ہو جاتا۔ (محمد ابن سعد: طبقات الکبریٰ: Mernissi: Women and Islam, p.172)۔ نبی کریمؐ کے لیے یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی کیونکہ آپؐ شرمیلے اور نازک مزاج واقع ہوئے تھے اور آپؐ کو ناخوشگوار جسمانی بدبو اور تکلیف دہ اور ناگوار سانسوں سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ آپؐ بوڑھے بھی ہوتے جا رہے تھے، ابھی آپؐ کے چند بال سفید ہوئے تھے اور آپؐ اب بھی پوری طاقت کے ساتھ چلتے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ کے پاؤں زمین کو چھوتے ہی نہیں۔ لیکن حضورؐ کی عمر ساٹھ برس ہو چکی تھی اور عرب میں یہ کوئی ناقابل لحاظ بات نہیں تھی۔

Marfat.com

آپؐ معرکہ احد میں زخمی ہو چکے تھے۔ یہ مسلسل دباؤ اور آثار اس وقت ظاہر ہونا شروع ہوئے جب پورا مدینہ مکی فوج کے ناگزیر جوابی حملے کا انتظار کر رہا تھا اور ملت اسلامیہ پہلے سے کہیں زیادہ نفاق اور اختلافات کا شکار تھی۔

(Lings: Muhammad, pp.107-8: Mernissi: Women and Islam, p.174)۔

حضرت ام سلمہؓ نے جیسے ہی مسجد میں رہائش اختیار کی، داخلی اختلافات کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ اس منفرد اور اعلیٰ حیثیت کی حامل اس خاتون کے حرم میں داخلے پر سخت رنجیدہ ہو گئیں اور حرم دو حصوں میں بٹ گیا جس سے خود امت میں پائی جانے والی بے چینی کی عکاسی ہوتی ہے۔ ام سلمہؓ زیادہ دولت مند مہاجرین کی نمائندگی کرتی تھیں جب کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی بیٹیوں عائشہؓ اور حفصہؓ کا تعلق عام لوگوں پر مشتمل برسر اقتدار جماعت سے تھا۔ آپؐ کی ہر زوجہ محترمہؓ ان دو مخالف دھڑوں میں سے ایک کی حمایت حاصل کرتیں۔ حضرت ام سلمہؓ عموماً حضورؐ کے قریبی خاندان اہل بیت کے تیسرے گروپ کی حمایت پر انحصار کرتیں۔ آں حضرتؐ سے ان کی شادی کے وقت یہ تقسیم محض ابتدائی مرحلے میں تھی لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ امت مسلمہ ایک ہی پتھر سے بنی عمارت نہیں اور جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، وہ مختلف توقعات کے زیر اثر مسلمان ہوئے تھے۔

حضرت ام سلمہؓ جلد ہی مدینے کی عورتوں کی ترجمان بن گئیں۔ (طبری: تفسیر: .....)
(Mernissi: Women and Islam, pp.115-31)۔ رسول کریمؐ کے رہن سہن کے انتظامات نے، جن کی وجہ سے آپؐ کی ازواج مطہراتؓ کو جسمانی اعتبار سے ملت اسلامیہ کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، مسلم خواتین کو اپنے رول کے بارے میں ایک نیا وژن دے دیا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ابھی نوجوان لڑکیاں تھیں اور ان کا رویہ بعض اوقات لاابالی اور خودغرضی پر مبنی ہوتا لیکن حضرت ام سلمہؓ کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ ان کی شادی کے فوراً بعد خواتین کے ایک وفد نے ان سے سوال کیا کہ قرآن پاک میں عورتوں کا بہت کم ذکر کیوں ہوا ہے؟ حضرت ام سلمہؓ ان کے اس سوال کو حضورؐ کے پاس لے گئیں جنہوں نے معمول کے مطابق جواب دینے میں تاخیر کر دی۔ چند روز کے بعد جب وہ اپنے حجرے میں بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں تو انہوں نے رسول اللہؐ کو مسجد میں یہ نئی انقلابی سورت تلاوت کرتے سنا:

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز خواتین، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور

Marfat.com

حفاظت کرنے والیاں، بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں، ان (سب کے) لیے اللہ تعالیٰ نے (وسیع) مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔ (سورہ الاحزاب آیت ۳۵۔ مترجم)۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں جنس کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں میں مکمل مساوات موجود تھی اور دونوں طبقوں کو یکساں فرائض اور ذمے داریاں سونپی گئی ہیں۔ جب عورتوں نے یہ آیتیں سنیں تو انہوں نے اس وژن کو اپنی روزمرہ زندگیوں میں ٹھوس حقیقت بنانے کا پختہ عزم کر لیا۔

یوں لگتا تھا کہ خدا بھی عورتوں کا طرفدار تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک مکمل سورت ان کے نام سے موسوم کر دی گئی۔ اب عورتیں اونٹوں یا کھجوروں کی طرح مردوں کی میراث نہیں رہی تھیں۔ اب وراثت میں ان کے لیے حصہ مقرر کر دیا گیا تھا اور وہ مردوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ (ماں باپ یا قرابت دار جو چھوڑیں، اس کے وارث ہم نے ہر شخص کے مقرر کر دیے ہیں اور جن سے تم نے اپنے ہاتھوں معاہدہ کیا ہے انہیں ان کا حصہ دو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر ہے۔ سورہ النسا آیت ۳۳۔ مترجم)۔ کوئی یتیم لڑکی منقولہ جائیداد نہیں اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کے سرپرست کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ظہور اسلام سے پہلے کے دور کی طرح اسلام نے بھی عورتوں کے طلاق کی کارروائی شروع کرنے کے اختیار کو برقرار رکھا البتہ شوہر طلاق کی درخواست کو ماننے سے انکار کر سکتا تھا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ دولہا دلہن کو روایتی طور پر تحائف دیا کرتا تھا لیکن یہ تحائف دلہن کے خاندان کی ملکیت ہوتے۔ اب شوہر بیوی کو براہ راست تحائف دیتا جنہیں اس کی ناقابل منتقلی ملکیت تصور کیا جاتا اور طلاق کی صورت میں مرد ان کی واپسی کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح اسلام نے عورتوں کے تحفظ کو یقینی بنا دیا۔ قرآنی احکام کی رو سے ہر فرد آزاد اور خود مختار ہے اور خواتین پر بھی اسی قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ ساتویں صدی کے عرب میں یہ ایک چونکا دینے والی اختراع تھی جس سے امت کے مرد غضبناک ہو گئے۔ خدا انہیں ان کے حقوق سے محروم کر رہا تھا! یہ مسلمان خدا کے لیے جنگ میں جان تک کی بازی لگانے کو تیار تھے لیکن اب خدا ذاتی زندگیوں میں ان سے قربانی کا مطالبہ کر رہا تھا! مدینہ کے مسلمان خاص طور پر طیش میں آ گئے۔ کیا عورتوں کو حصہ دینے کے لیے انہیں اپنی زیر کاشت زمینیں تقسیم کرنا پڑیں گی؟ ''لیکن کیسے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''کیا وہ ان عورتوں اور بچوں کو وراثت میں حصہ دیں گے جو کام نہیں کرتے اور جو اپنی روزی نہیں کماتے؟ کیا اب انہیں کام کرنے والے مردوں کی طرح وراثت میں حصہ ملے گا؟ کیا رسول خداؐ سنجیدگی سے انہیں یہ بتا رہے ہیں کہ ایک بدصورت لڑکی کو بھی ورثے میں دولت مل سکتی ہے؟''، ''ہاں! یقیناً۔'' آں حضرتؐ نے جواب دیا۔ (طبری: تفسیر: Mernissi: Women and Islam, pp.131-32: Ahmad: Women and Gender in Islam, p.53)۔ بعضوں نے اس قانون سے بچ نکلنے کی کوشش کی لیکن خواتین نے حضورؐ

Marfat.com

سے شکایت کردی اور قرآن پاک نے ان کی حمایت کی۔ (اے ایمان والو! تمہیں حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے ورثے میں لے بیٹھو۔ انہیں اس لیے روک نہ رکھو کہ جو تم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے کچھ لے لو، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی کھلی برائی اور بے حیائی کریں۔ ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش رکھو گو تم انہیں ناپسند کرو لیکن بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔ سورہ النسا آیت ۱۹۔ مترجم)۔

اب عورتوں نے ایک اور مطالبہ کر دیا۔ چونکہ غزووں کو معیشت میں اہم حیثیت حاصل تھی اس لیے انہیں بھی ہتھیار رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ یہ سوال لے کر ایک مرتبہ پھر آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ (طبری: تفسیر: Mernissi: Women and Islam, p.132)۔ غزوے کی معیشت پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ غزوے کے دوران جس عورت کو قیدی بنا لیا جاتا، اسے ایک قیمتی مال غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ اسے فروخت کیا جا سکتا، اس کے ساتھ شادی کر لی جاتی، اس سے مشقت لی جاتی یا اسے عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا۔ اگر عورتوں کو جنگ کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو وہ بے عملی کا شکار ہو کر قیدی بنائے جانے کا انتظار نہ کرتیں اور اس طرح غزوے کی آمدنی میں زبردست کمی واقع ہو جاتی۔ اس مسئلے پر امت میں پھوٹ پڑ گئی اور غصے سے مغلوب ان مردوں نے رسول خداؐ کو گھیرے میں لے لیا جو یہ محسوس کرتے تھے کہ اللہ انہیں بیجڑا بنا رہا ہے۔ حضرت عمرؓ بھی خواتین کے ساتھ آں حضرتؐ کے حسن سلوک کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے اور آپؐ بدستور یہ اصرار کرتے رہے کہ اللہ نے اپنی منشا اور رضا کا کھل کر اظہار کر دیا ہے۔

لیکن عورتوں نے اپنی تحریک کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ ایک ایسے موقعے پر، جب امت کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا، مردوں کے لیے خواتین کا یہ مطالبہ ماننا بہت مشکل تھا۔ وراثت اور طلاق کے قوانین برقرار رہے لیکن رسول کریمؐ نے یہ اندازہ لگا لیا کہ مدینہ میں آپؐ کے دشمن ان انقلابی قوانین سے سیاسی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور یہ کہ آپؐ کے بعض انتہائی قریبی ساتھی بھی اس نازک مرحلے پر آپؐ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اب عورتوں کو زدوکوب کرنے کا سوال آں حضرتؐ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ (Mernissi: Women and Islam, pp.154-59)۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک دوسرے پر تشدد کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ شوہر جب بیویوں کی پٹائی کرتے تو وہ نبی کریمؐ سے ان کی شکایت کرتیں اور یہ مطالبہ کرتیں کہ قرآنی احکام کے مطابق مردوں کو بھی سزا دی جائے۔ بعض خواتین نے مار پیٹ کرنے والے شوہروں کے ساتھ خلوت میں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عورتوں پر تشدد

Marfat.com

کے سخت مخالف تھے: ''پیغمبر اسلامؐ نے اپنی کسی بیوی، غلام یا کسی بھی شخص پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔'' ابن سعد نے حضورؐ کی سیرت کے حوالے سے لکھا ہے: ''آپؐ عورتوں کو زدوکوب کرنے کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔'' (ابن سعد: طبقات)۔ لیکن آپؐ اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔ عمرؓ، ابن ابی بلکہ نرم دل ابوبکرؓ جیسے لوگ بھی اپنی بیویوں کو بلا روک ٹوک مارتے پیٹتے تھے۔ رسول کریمؐ کو معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کر رہا ہے چنانچہ مردوں کی وفاداری برقرار رکھنے کے لیے آپؐ کو اپنے موقف میں نرمی کرنا پڑی۔ ''بہت اچھا!'' حضورؐ نے اپنے برہم ساتھیوں کو بتایا: ''انہیں مارو لیکن ایسے طریقوں سے استعانت حاصل کرنا بدترین لوگوں کا کام ہے۔'' (ابن سعد: طبقات)۔ اس پر وحی نازل ہوئی جس میں عورتوں کو مارنے کی اجازت دے دی گئی لیکن آں حضرتؐ بہ ہر حال عورتوں کی پٹائی کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، پس نیک فرماں بردار عورتیں خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت الٰہی نگہداشت رکھنے والیاں ہیں اور جن عورتوں کی نافرمانی اور بددماغی کا تمہیں خوف ہو، انہیں نصیحت کرو اور انہیں الگ بستروں پر چھوڑ دو اور انہیں مار کی سزا دو پھر اگر تابعداری کریں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی بلندی اور بڑائی والا ہے۔ سورہ النسا آیت ۳۴۔ مترجم)۔ ''میں کسی غضبناک شخص کو اپنی بیوی کو زدوکوب کرتے نہیں دیکھ سکتا۔'' آپؐ نے فرمایا۔ (ابن سعد: طبقات)۔ مکہ والوں سے تنازع آپؐ کے روحانی کشف کے مطابق ایک مرتبہ پھر نازک صورت اختیار کرنے والا ہے اور آپؐ کو ایک ایسے لائحہ عمل پر کاربند رہنا ہوگا جس سے معمول کے حالات میں گریز کیا جا سکتا تھا۔ خواتین کے بارے میں قرآنی احکام جنگ کے متعلق قرآنی آیات سے پیوست ہیں اور اس وقت مدینہ میں رونما ہونے والے ہر واقعے پر اس کا اثر انداز ہونا یقینی تھا۔ رسول اللہؐ جانتے تھے کہ آپؐ ایک بے چین اور مضطرب فوج کے ساتھ مکہ کے خوفناک حملے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مارچ ۶۲۷ عیسوی میں قریش اور ان کے اتحادیوں کے دس ہزار لشکریوں پر مشتمل ایک بڑی فوج نے مدینہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

(Lings: Muhammad, pp.215-30: Watt: Muhammad at Medina,

pp.36-58: Mernissi: Women and Islam, pp.168-70)

نبی کریمؐ مدینہ اور خانہ بدوش قبائل سے صرف تین ہزار آدمیوں کی ادنیٰ تعداد اکٹھی کر سکے۔ مسلمانوں نے اس مرتبہ شجاعت اور جرأت مندی کا بے ہنگم مظاہرہ نہ کیا بلکہ خود کو نخلستان کے مرکز میں مورچہ بند کر لیا۔ مدینہ تین

Marfat.com

اطراف سے ڈھلوان دار چٹانوں اور آتش فشانی پتھروں میں گھرا ہوا تھا اور اس کا دفاع کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا تاہم شمال کی جانب سے شہر کا دفاع بہت کمزور تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس کے دفاع کے لیے ایک نومسلم غلام سلمان فارسیؓ کی تجویز پر ایک نئی حربی چال چلی۔ قریش کو کوئی عجلت نہیں تھی اور وہ پوری شان وشوکت اور اعتماد کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کو دفاع کے لیے خاصا وقت مل گیا۔ انہوں نے مضافات کے کھیتوں سے فصلیں اٹھالیں تاکہ اس مرتبہ اہل مکہ کو جانوروں کے لیے چارہ نہ مل سکے۔ بعد میں پوری امت مسلمہ نخلستان کے شمالی علاقے کے گرد ایک بڑی خندق کھودنے میں مصروف ہوگئی۔ نازک مزاج عربوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز بلکہ المناک واقعہ تھا۔ دور جاہلیت کا کوئی بھی خوددار جنگجو اپنے اور دشمن کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ عرب ایک غلام کی طرح زمین کو پھاوڑے سے کھودنے کو ایک حقیر کام سمجھتے تھے۔ لیکن آں حضرتؐ ہنستے مسکراتے، مذاق کرتے اور رجز پڑھتے ہوئے صحابہؓ کے شانہ بشانہ کام کرتے رہے۔

قریش جب اپنی فوج لے کر پہنچے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خندق کو دیکھنے لگے۔ خندق سے باہر نکلنے والی مٹی سے ایک بہت بڑی دیوار بن گئی جو سطح پہاڑ کے دامن میں لشکر اسلامی کے لیے ایک مضبوط ڈھال بن گئی تھی۔ اس سے مسلمانوں کو قریش کے مقابلے میں برتری حاصل ہوگئی جہاں سے انہوں نے دشمن پر تیر برسانے شروع کردیے۔ خندق کو دیکھ کر قریش ششدر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے ایسی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی تھی۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ٦٧٧ : The Life of Muhammad)۔ قریش کو جن گھڑسوار دستوں پر بڑا ناز تھا، وہ بے کار ہو گئے کیونکہ گھوڑے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دو موقعوں پر جب گھوڑے خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سواروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔

مدینے کا محاصرہ صرف ایک ماہ تک جاری رہا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ عمل ایک نامعلوم زمانے تک جاری رہے گا۔ مدینہ کے اتحادیوں کے علاوہ اپنے لوگوں کے سامان رسد کی فراہمی سے شہر کی معیشت پر بہت بوجھ پڑ گیا۔ ابن ابی اور اس کی پارٹی نے حضورؐ پر الزام لگایا کہ آپؐ کی وجہ سے مدینہ تباہ ہو رہا ہے۔ (ان ہی کی ایک جماعت نے ہانک لگائی کہ اے مدینہ والو! تمہارے لیے ٹھکانہ نہیں، لوٹ چلو اور ان کی ایک اور جماعت یہ کہہ کر نبیؐ سے اجازت مانگنے لگی کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ (کھلے ہوئے اور) غیر محفوظ نہ تھے (لیکن) ان کا پختہ ارادہ بھاگ کھڑے ہونے کا تھا۔ سورہ الاحزاب آیت ١٣۔ مترجم)۔ قریظہ کے یہودی قبیلے نے سرعام قریش کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ خیبر کے یہود نے قریش کی فوج میں شامل ہونے کے لیے ایک بڑا دستہ بھیجا جس میں جلاوطن یہودی قبیلے بنونضیر کے بہت سے جنگجو بھی شامل تھے۔ مکی فوج کے مدینہ پہنچنے سے

Marfat.com

پہلے بنونضیر کے سردار حیی ابن اخطب نے بنوقریظہ کو یہ ترغیب دی کہ وہ عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں یا بنونضیر کے دو ہزار جنگجو مدینہ میں گھس کر قلعوں میں محصور مسلمان عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیں۔ بنوقریظہ شروع میں متذبذب تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قریش ایک بڑے لشکر کو لے کر مدینہ آ گئے ہیں جس نے پورے افق کو ڈھانپ رکھا ہے تو ان کا سردار قریش کو ہتھیار اور سامان رسد فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب یہود کی غداری کا علم ہوا تو آپؐ سخت پریشان ہو گئے۔ آپؐ نے سعدؓ بن معاذ کو، جو ہجرت سے پہلے بنوقریظہ کے سب سے بڑے عرب اتحادی تھے، بات چیت کے لیے یہودیوں کے پاس بھیجا لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ایک مرحلے پر بنوقریظہ نے مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع قلعوں پر حملے شروع کر دیے لیکن انہیں ناکام بنا دیا گیا۔ تقریباً تین ہفتوں تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مستقبل میں یہود کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟

جنگ خندق کے پورے عرصے کے دوران مسلمان خوف زدہ رہے۔ ایسے موقعے بھی آئے کہ مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ انہیں مدینہ سے نکال باہر کیا جائے گا۔ بعض مسلمان تو بہت زیادہ مایوس ہو چکے تھے۔ (جب کہ (دشمن) تمہارے پاس اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہیں مومن آزمائے گئے اور پوری طرح وہ جھنجھوڑ دیے گئے۔ سورہ الاحزاب آیات ۱۰، ۱۱۔ مترجم)۔ اگرچہ شہر کے اندر مسلمان خوف سے کانپتے تھے، خندق کے اس پار قریش بھی مسلسل حالت جنگ میں رہنے کے باعث اکتا گئے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی ناکافی چیزیں تھیں اور فوجی امور میں ناتجربہ کاری کا مطلب یہ تھا کہ اچانک افتاد سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جب اچانک ایک طوفان آیا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ ابوسفیان نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا۔ گھوڑے اور اونٹ مر رہے تھے، بنوقریظہ قریش کی کوئی مدد نہ کر سکے اور ابوسفیان کی فوج کے پاس خیمے، آگ اور کھانے کے برتن تک نہ بچے تھے۔ ''سب کوچ کر چلو۔'' ابوسفیان نے اپنے لشکریوں سے کہا: ''میں بھی کوچ کر رہا ہوں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۶۳۸: The Life of Muhammad, p.460)۔ اگلی صبح مسلمانوں نے ٹیلے کے اوپر سے دیکھا تو میدان مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔

لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب بنوقریظہ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ قریش کی واپسی سے مدینہ کے اندر حضورؐ کی قیادت کی شدید مخالفت کم نہ ہوئی۔ آپؐ کے دشمنوں کو یقین تھا کہ مکہ کی فوج واپس چلی جائے گی جس کے بعد انہیں سخت ذلت اور انتقام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے رسول کریمؐ کے خلاف مہم کو تیز کر دیا۔ مدینہ خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا اور بنوقریظہ اس دھماکہ خیز صورت حال میں سزا سے

Marfat.com

نہیں بچ سکتے تھے۔ مکہ کی فوج واپس ہونے کے بعد دوسرے روز آں حضرتؐ کے دستوں نے بنوقریظہ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہودیوں نے درخواست کی کہ انہیں بھی بنوقینقاع اور بنونضیر کی شرطوں پر مدینہ سے چلے جانے کی اجازت دی جائے لیکن اس مرتبہ رسول پاکؐ نے انکار کر دیا۔ بنونضیر جلاوطنی میں بھی ملت اسلامیہ کے لیے خطرناک ثابت ہوئے تھے۔ بنوقریظہ کے سرداروں نے اپنے سابق اتحادی سعدؓ بن معاذ کو ثالث تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کردی جو محاصرے کے دوران شدید زخمی ہوگئے تھے۔ انہیں ایک سواری پر بٹھا کر قریظہ گاؤں لے جایا گیا۔ اگرچہ بعض دوسرے قبیلوں نے حضرت سعدؓ سے کہا کہ وہ یہود سے رحم کا سلوک کریں لیکن سعدؓ کو یقین تھا کہ بنوقریظہ ایک ناقابل قبول سیکورٹی رسک ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس روایتی فیصلے کا اعلان کردیا کہ قبیلے کے کل سات سو مردوں کو قتل کردیا جائے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی تمام جائیداد مسلمانوں میں تقسیم کردی جائے۔ حضورؐ نے یہ فیصلہ سنا تو فرمایا: ''تم نے بنوقریظہ کے بارے میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ سنایا ہے جو آسمانوں سے آیا ہے۔'' (یعنی جو احکام تورات کے مطابق ہے)۔ (محمد ابن اسحاق سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۶۸۹: The Life of Muhammad, p.464)۔ اگلے روز سزا پر عمل درآمد ہوگیا۔

بغاوت، جیسا کہ ہم آج بھی سمجھتے ہیں، ایک سنگین جرم ہے اور عرب میں ہر شخص حضرت سعدؓ سے اسی فیصلے کی توقع کرتا تھا۔ قدیم دستاویزات کے مطابق خود بنوقریظہ کو بھی اس فیصلے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس سزا سے خیبر کے یہودیوں کو بھی یہ ہیبت ناک پیغام مل گیا اور خانہ بدوش قبیلوں کو بھی یہ معلوم ہوگیا کہ رسول خداؐ میں جوابی کارروائی کرنے کی بھرپور استعداد موجود ہے۔ آپؐ نے طاقت کا دلیرانہ مظاہرہ کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ امید پیدا ہوگئی کہ یہودیوں کے ساتھ تنازع ختم ہو جائے گا۔ اس زمانے کے پرآشوب اور وحشی معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں لیکن اس پیمانے پر تشدد اور ہلاکتوں کو اس معاشرے کا معیار اور نمونہ سمجھا جاتا تھا۔

(Aslan: No god but God: pp.91-98: Norman Stilman:

- The Jews of Arab Lands)

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ بنوقریظہ کے یہودیوں کو مذہبی یا نسلی بنیادوں پر قتل نہیں کیا گیا تھا۔ نخلستان میں آباد دوسرے یہودی قبائل نے اس پر اعتراض نہ کیا اور نہ ہی اس معاملے میں مداخلت کی جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک خالص سیاسی اور قبائلی معاملہ تھا۔ بنوقریظہ کے حاشیہ نشین عرب قبیلے بنوقیلہ کے متعدد افراد کو بھی یہودیوں کے ساتھ سزائے موت دی گئی۔ یہودیوں سے حضورؐ کا کوئی نظریاتی تنازع نہیں تھا۔ آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''جو کوئی کسی یہودی یا عیسائی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے یا اسے تباہ کرتا ہے، قیامت کے روز مجھے اس کا جواب دینا پڑے گا۔'' بنوقریظہ کے مردوں کو بلاجواز قتل نہیں کیا گیا تھا۔ سترہ دوسرے یہودی قبیلے بدستور

Marfat.com

نخلستان میں موجود رہے اور کئی برسوں تک مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ قرآن مجید بھی مسلسل یہ اصرار کرتا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کے ساتھ اپنی روحانی قرابت یاد رکھنی چاہیے۔

اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو، مگر ان کے ساتھ جو ان میں ظالم ہیں اور صاف اعلان کر دو کہ ہمارا تو اس کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم پر اتاری گئی، ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ہم سب اسی کے حکم بردار ہیں۔ (سورہ العنکبوت آیت ۴۶)۔

بعد میں اسلامی سلطنتوں میں یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی اور جب تک بیسویں صدی کے وسط میں عرب اسرائیل تنازعے نے شدت اختیار نہیں کی، اس وقت تک سامی نسل سے دشمنی کو مسلمانوں سے منسوب نہیں کیا جاتا تھا۔

ممکن ہے کہ رسول کریمؐ کے زمانے کے عرب بنوقریظہ کے المیے کو درست اور ناگزیر سمجھتے ہوں لیکن آج ہمارے لیے یہ المیہ قابل قبول نہیں۔ خود حضورؐ بھی اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ کا اصل نصب العین جاہلیت کے تشدد کا خاتمہ کرنا تھا لیکن اب آپؐ کا طرز عمل ایک عام عرب سردار کا سا تھا۔ آپؐ کو قطعی امن قائم کرنے کے لیے مجبوراً جنگ لڑنا پڑی تھی۔ لیکن اس سے تشدد، انتقامی کارروائیوں، ظلم وتعدی اور جوابی انتقام کا ایک ایسا سلسلہ چل پڑا جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم تھا۔ جب آپؐ قریظہ گاؤں سے اس شہر کی جانب روانہ ہوئے جو ابھی تک غصے اور افسردگی سے آلودہ تھا تو آپؐ نے یقیناً یہ محسوس کیا ہوگا کہ اس تنازعے کو ختم کرنے کے لیے آپؐ کو کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا چاہیے تھا۔ بہ ہر حال آپؐ کو یہ جاہلی رویہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر کے ایک مختلف حل دریافت کرنا تھا۔

Marfat.com

پانچواں باب

سلام

قریش پر حضورؐ کی فتح کے نتیجے میں جزیرہ نما میں آپؐ کے وقار اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اگلے چند مہینوں کے دوران آپؐ نے مکہ کے اتحاد میں شامل قبیلوں کے خلاف اس امید کے ساتھ کئی مہمیں روانہ کیں کہ اس سے قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کا عمل تیز ہو گا، ان کی تجارت کو نقصان پہنچے گا اور شام جانے والے تجارتی کارواں مدینہ کا رخ کر لیں گے۔ آپؐ کی مسلسل کامیابیوں کے باعث بہت سے عربوں کے ذہن میں روایتی مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ عرب عملیت پسند لوگ تھے اور انہیں فرضی اور قیاسی مباحث کے مقابلے میں کسی بھی مذہبی نظام کے عملی فوائد سے زیادہ دلچسپی تھی۔ مدینہ کے محاصرے کے بعد جب مکہ کی فوج واپس روانہ ہوئی تو قریش کے نامور سپہ سالار خالد بن الولید نے بھی کہہ دیا تھا: ''ہر سمجھ دار شخص اب یہ جان گیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جھوٹ نہیں بولا۔'' (محمد ابن عمر الواقدی: کتاب المغازی صفحات ۴۸۸ تا ۴۹۰:

Martin Lings: Muhammad, His Life Based on the Earliest Sources, p.227)۔

پرانے مذہب پر سختی سے کاربند لوگ بھی بتدریج اسلام قبول کرنے لگے۔ مکہ کے تجارتی قافلے پر حملے کے دوران آں حضرتؐ کے سابق داماد ابوالعاص کو، جو مسلمان ہونے کے بجائے اپنے خاندان کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے، قیدی بنا لیا گیا۔ آپؐ نے انہیں رہا کرنے اور ان کا سامان تجارت واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ ابوالعاص آپؐ کے فیاضانہ عمل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مکہ میں تجارتی سامان ان کے مالکوں کو لوٹانے کے بعد ہجرت کر لی، اسلام قبول کر لیا اور حضرت زینبؓ اور اپنی کمسن بچی کے ساتھ دوبارہ جا ملے۔

Marfat.com

عرب میں مجموعی طور پر ہوا کا رخ حضورؐ کے حق میں مڑ گیا تھا لیکن مدینہ کے اندر مخالفت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ وہاں تنازع کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ابن ابی ہر روز اس جانب اشارہ کرتا کہ مدینہ کی قیادت ابھی اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ عرب کے انتہائی طاقتور شہر کی شدید دشمنی کے بغیر بھی یثرب میں امن وامان قائم ہوسکتا ہے۔ رسول خداؐ کے دشمن کھلے بندوں آپؐ پر شاذ ہی حملہ کرتے بلکہ انہوں نے خفیہ طور پر آپؐ کے خلاف ایک مکروہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ آپؐ نے خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے جو متنازع کوششیں شروع کر رکھی تھیں، مخالفین کے لیے وہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں اور انہوں نے ازواج مطہراتؓ کے بارے میں جھوٹی اور گمراہ کن افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ بعضوں نے یہ ہرزہ سرائی کی کہ کئی پرکشش ازواجؓ پر ان کی نظر ہے اور وہ آپؐ کی وفات کے بعد ان کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آپؐ کے قتل کا عندیہ تھا۔ (Fatima Mernissi: Women and Islam, pp.17-172)۔ یہ سرگوشیاں بھی ہو رہی تھیں کہ آپؐ (نعوذ باللہ۔ مترجم) اس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں کہ ازواج مطہراتؓ کو مطمئن نہیں کر سکتے اور یہ کہ آپؐ کو جنسی عوارض لاحق ہو گئے ہیں۔ (ان میں سے جسے تو چاہے دور رکھ دے اور جسے چاہے اپنے پاس رکھ لے، اور اگر تو ان میں سے کسی کو اپنے پاس بلا لے جنہیں تو نے الگ کر رکھا تھا تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں، اس میں اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ ان عورتوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ بھی تو انہیں دے دے اس پر سب کی سب راضی رہیں۔ اگر (اب بھی) یہ منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں غلط افواہیں اڑانے والے ہیں باز نہ آئے، تو ہم آپؐ کو ان (کی تباہی) پر مسلط کر دیں گے پھر تو وہ چند دن ہی آپؐ کے ساتھ اس (شہر) میں رہ سکیں گے۔ سورہ الاحزاب آیات ۵۱، ۶۰۔ مترجم)۔ صفوان نامی نوجوان اور حضرت عائشہؓ کے بارے میں بھی بغض اور حسد سے کئی افواہیں پھیلائی گئیں۔ جب انبوہ کی صورت میں لوگ اپنے سوال اور شکایتیں لے کر ازواج مطہراتؓ کے حجروں میں آتے تو کئی لوگ حضورؐ کی نظروں کے سامنے امہات المومنینؓ کی توہین کر دیتے۔ یہ صورت حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ جب رات کو موسم قدرے ٹھنڈا ہوتا تو مدینہ کی گلیوں میں چہل پہل ہوتی اور لوگ تازہ ہوا میں چہل قدمی اور باہمی میل ملاپ کے لیے گھروں سے نکل آتے البتہ محاصرے کے بعد گلیوں میں عورتوں پر حملے ہونے لگے۔ ازواج مطہراتؓ جب اکٹھے باہر نکلتیں تو منافقین ان کا پیچھا کرتے، فحش آوازے کستے اور گھٹیا اشارے کرتے۔ (اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیں بغیر کسی جرم کے جو ان سے سرزد ہوا ہو، وہ (بڑے ہی) بہتان اور صریح گناہ کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوںؓ سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی۔ پھر نہ

Marfat.com

ستائی جایا کریں گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ سورہ الاحزاب آیات ۵۸، ۵۹۔ مترجم)۔ جب ان لوگوں کو فحش حرکات سے منع کیا جاتا تو وہ یہ بہانہ کرتے کہ انہوں نے اندھیرے میں خواتین کو غلطی سے لونڈیاں سمجھ لیا ہے جنہیں ہراساں کرنے میں کوئی حرج تصور نہیں کیا جاتا تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پچھلے کئی برسوں کی جاں گسل جدوجہد اور سخت کوشی کے باعث جذباتی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہو چکے تھے۔ آپؐ کو جذباتی طور پر ہمیشہ ازواج مطہراتؓ پر بھروسا کرنا پڑتا جس کی وجہ سے آپؐ نقاہت محسوس کرنے لگے تھے۔ آں حضرتؐ نے جب ایک اور شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو زبانیں دوبارہ حرکت میں آ گئیں۔ (Lings: Muhammad, pp. 212-14: Tor Andrae: Muhammad, The Man and His Faith, pp.215-16) حضرت زینبؓ بنت جحش ہمیشہ سے حضورؐ کے بہت قریب رہی تھیں، وہ آپؐ کی پھوپھی زاد اور آپؐ کے متبنیٰ بیٹے حضرت زیدؓ کی بیوی تھیں۔ آں حضرتؐ نے ہجرت کے بعد خود ان کی شادی کرائی تھی حالانکہ حضرت زینبؓ اس شادی کے بارے میں زیادہ پرجوش نہیں تھیں۔ حضرت زیدؓ جسمانی اعتبار سے دل کش نہیں تھے اور ممکن ہے کہ حضرت زینبؓ اس سے پہلے رسول کریمؐ کے ساتھ شادی کرنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ حضرت زینبؓ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی لیکن عرب کے موسمی شدائد اور حالات کے باوجود وہ اب بھی بے حد خوبصورت تھیں۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں اور انہیں چمڑے کی چیزیں بنانے میں کمال مہارت حاصل تھی۔ اس کام سے انہیں جتنی بھی آمدنی ہوتی، وہ اسے غریبوں میں بانٹ دیتیں۔ رسول خداؐ ایک دن سہ پہر کو حضرت زیدؓ سے ملنے ان کے گھر گئے تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ اس دوران حضرت زینبؓ پر آپؐ کی نظر پڑ گئی اور یوں لگتا ہے کہ اس اچانک اور اتفاقیہ ملاقات میں آپؐ نے ایک نئے زاویے سے حضرت زینبؓ کو دیکھا جس کے نتیجے میں آپؐ کو اچانک ان سے محبت ہو گئی۔ چونکہ حضرت زینبؓ کو اس وقت کسی مہمان کے آنے کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ خلاف معمول مختصر لباس پہنے دروازے پر آ گئیں۔ چنانچہ حضورؐ نے تیزی کے ساتھ اپنی نگاہیں ان کے چہرے سے ہٹا لیں اور واپس مڑتے ہوئے یہ الفاظ آپؐ کے منہ سے نکل گئے: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو انسانوں کے دلوں کو پلٹ دیتا ہے۔'' اس واقعے کے چند روز بعد زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ یہ شادی کبھی خوشی اور طمانیت کا باعث نہیں بنی تھی چنانچہ حضرت زیدؓ اس علیحدگی سے خوش تھے۔ اس قصے سے رسول اللہؐ کے ان مغربی نکتہ چینوں کو صدمہ پہنچا ہے جو عیسائی ہیروز کو راہبوں کے بھیس میں دیکھنے کے عادی ہیں تاہم مسلمان ماخذوں اور ذرائع کو اپنے پیغمبرؐ کی مردانہ صفت کے اظہار میں کوئی ناخوشگوار بات نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ حضورؐ کی چار سے زیادہ بیویوں سے پریشان ہوتے ہیں۔ خدا کی طرف سے اپنے پیغمبرؐ کو چند اضافی مراعات

Marfat.com

کیوں نہیں ملنی چاہییں؟ مدینہ میں آپؐ کے دشمنوں نے جس بات کو اسکینڈل بنایا، وہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کی آں حضرتؐ کے لے پالک بیٹے زیدؓ کے ساتھ شادی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رسول کریمؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ یہ نکاح یقیناً حرام نہیں ہے۔ (اور دیکھو) کسی مومن مرد عورت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔ (یاد کرو) جب تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تو نے بھی کہ تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں یہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے خوف کھاتا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تو اس سے ڈرے، پس جب کہ زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی، ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا تا کہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح تنگی نہ رہے جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کر لیں۔ اللہ کا یہ (حکم) تو ہو کر ہی رہنے والا تھا۔ جو چیزیں اللہ نے اپنے نبیؐ کے لیے مقرر کی ہیں ان میں نبیؐ پر کوئی حرج نہیں۔ (یہی) اللہ کا دستور ان میں بھی رہا جو پہلے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے کام اندازے پر مقرر ہوئے ہیں۔ یہ سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ (لوگو) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کو ختم کرنے والے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (بخوبی) جاننے والا ہے۔ سورہ الاحزاب آیات ۳۶ تا ۴۰۔ مترجم)۔ جب یہ وحی نازل ہوئی تو آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس تھے چنانچہ انہوں نے حسد اور ترش روئی کے ساتھ حضورؐ سے کہا: ''بے شک آپؐ کے خدا نے آپؐ کی خواہش بڑی جلدی پوری کر دی ہے۔'' معمول کے مطابق حرم میں کشیدگی مجموعی اعتبار سے پوری ملت اسلامیہ میں اختلافات کی آئینہ دار تھی۔ اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ آں حضرتؐ کی شادی سے آپؐ کے خاندان کے سیاسی مقاصد کو تقویت ملی اور یہ شادی اہل بیت کے نصب العین میں پیش رفت کا باعث بنی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس اسکینڈل کی وجہ سے اس بات پر اصرار کیا کہ پوری مسلم برادری کو شادی کی تقریب میں شرکت کرنی چاہیے۔ اس موقعے پر مسجد کا صحن مہمانوں سے بھر گیا۔ ان میں کئی لوگوں کا حضورؐ کے ساتھ رویہ جارحانہ تھا جس کی بنا پر ماحول ناخوشگوار ہو گیا۔ آخر یہ ضیافت اپنے اختتام کو پہنچی لیکن لوگوں کی ایک مختصر جماعت حضرت زینبؓ کے نئے حجرے میں رکی رہی اور انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ وقت دولہا اور دلہن کی خلوت کا ہے۔ آں حضرتؐ حجرے سے باہر نکل کر دوسری ازواج مطہراتؓ کے پاس جا بیٹھے۔ آپؐ کو امید تھی کہ موقع محل کا خیال نہ رکھنے والے مہمان آپؐ کا اشارہ سمجھ جائیں گے۔

Marfat.com

''آپؐ کو نئے ساتھی کی رفاقت کیسے لگی؟'' حضرت عائشہؓ نے تیز لہجے میں حضورؐ سے دریافت کیا۔ آخر آپؐ حضرت زینبؓ کے حجرے میں واپس آ گئے۔ اس سے پہلے آپؐ کے دوست انسؓ بن مالک نے خوش گپیوں میں مصروف لوگوں کو حجرے سے نکال دیا تھا۔ آپؐ نے اپنے اور انسؓ کے درمیان ایک پردہ (حجاب) ڈال دیا اور وحی کے یہ الفاظ پڑھنے لگے:

اے ایمان والو! جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے، تم نبیؐ کے گھروں میں نہ جایا کرو کھانے کے لیے ایسے وقت میں کہ ان کے پکنے کا انتظار کرتے رہو بلکہ جب بلایا جائے، جاؤ اور جب کچھ کھا چکو، نکل کھڑے ہو، وہیں باتوں میں مشغول نہ ہو جایا کرو۔ نبیؐ کو تمہاری باتوں سے تکلیف ہوتی ہے تو وہ لحاظ کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ (بیان) حق میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جب تم نبیؐ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو، تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے۔ نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم رسول اللہؐ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ کسی وقت بھی آپؐ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ (یاد رکھو) اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا (گناہ) ہے۔ سورہ الاحزاب آیت ۵۳)۔

اس آیہ کریمہ میں امہات المومنینؓ کو آپؐ کی رحلت کے بعد شادی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں حجاب اوڑھنے کا بھی حکم دیا گیا ہے تا کہ گھر سے باہر ان کی پہچان ہو سکے اور انہیں ہراساں نہ کیا جا سکے۔

حجاب سے متعلق آیات حد درجہ متنازع ہیں: (Mernissi: Women and Islam, pp.88-191: Leila Ahmad: Women and Gender in Islam, pp.53-57) پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد تیسری نسل نے تمام عورتوں کے حجاب اوڑھنے اور انہیں گھر کے علیحدہ حصے میں رہائش اختیار کرنے کا دستور العمل اپنا لیا۔ ہمیں ان آیات کا اس زمانے کے حالات کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ یہ آیات ۳۳ ویں سورت میں شامل ہیں جس میں مدینے کے محاصرے کا بھی تذکرہ ہوا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس ہولناک صورت حال کے پس منظر میں اس پر غور کرنا چاہیے۔ ان ہدایات کا تمام مسلم خواتین پر نہیں، صرف ازواج مطہراتؓ پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امہات المومنینؓ کو حضورؐ کے دشمنوں کی طرف سے سنگین خطرات لاحق تھے۔ محاصرے کے بعد مدینے کی فضا اس قدر مسموم ہو چکی تھی کہ رسول اللہؐ کو اپنے ذاتی انتظامات میں تبدیلی کرنا پڑی۔ مسجد میں کوئی کشادہ مکان موجود نہیں تھا اس لیے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ازواج مطہراتؓ کے تنگ حجروں میں جمگھٹا لگانے کے بجائے پردے کے پیچھے سے ان کے ساتھ رابطہ کریں۔ لفظ حجاب کا مصدر حجب یعنی چھپنا ہے۔ پردے کی بدولت ایک دہلیز یا چوکھٹ قائم ہو گئی، ایک ممنوعہ یا مقدس علاقے کی حدود

Marfat.com

متعین ہوگئیں اور کعبے کی طرح حجروں کے اگلے حصوں کو پردوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ کمزوری کے زمانے میں عورتوں کے جسموں کو عموماً خطرات سے دوچار قوم کی علامت سمجھا جاتا ہے اور خود ہمارے اپنے عہد میں بھی حجاب نے ایک نئی اہمیت اختیار کر لی ہے اور یوں لگتا ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے آپ کو مغرب کے خطرے سے محفوظ کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی نجی زندگی اور عوامی فرائض کی انجام دہی کو ایک دوسرے سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آپؐ امہات المومنینؓ کو فوجی مہموں میں بدستور اپنے ساتھ لے جاتے رہے البتہ اب وہ اپنے خیموں کے اندر رہتیں۔ لیکن امت کی دوسری خواتین آزادانہ طور پر نخلستان کے اردگرد گھومتی رہتیں۔ حجاب نے انہیں مردوں سے الگ تھلگ نہیں کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب حجاب کے بارے میں وحی نازل ہوئی تو پردہ صرف دو آدمیوں، رسول اللہؐ اور انسؓ کے درمیان ڈالا گیا تھا۔ اس کا مقصد شادی شدہ جوڑے کو باقی امت سے الگ کرنا تھا۔ حجاب کا حکم حضرت عمرؓ کی فتح تھی جو رسول کریمؐ پر مسلسل یہ زور دیتے رہے تھے کہ آپؐ ازواج مطہراتؓ کو کچھ عرصے کے لیے الگ کر دیں۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلے کا سطحی حل تھا۔ رسول خداؐ لوگوں کا رویہ تبدیل کرنا چاہتے تھے اور اس بیرونی رکاوٹ کو کھڑا کرنا ایک مفاہمت کے مترادف تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے کاموں پر داخلی کنٹرول حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضورؐ نے اس بحران کے پیش نظر، جس نے مدینے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، حضرت عمرؓ کے نقطہ نظر سے اختلاف نہ کیا۔

لیکن صورت حال بہتر نہ ہوئی۔ حجاب کے نفاذ کے چند ہفتوں کے بعد رسول خداؐ کے دشمنوں نے بغض اور حسد کی بنا پر حضرت عائشہؓ کے خلاف ایک شدید حملہ کیا جس سے حضورؐ کو سخت صدمہ پہنچا اور آپؐ کے دشمن ملت اسلامیہ کو تقسیم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ (Mernissi: Women and Islam, pp.177-78: Lings: Muhammad, pp.235-45; W. Montgomery Watt: Muhammad at Madina, pp.185-86; Ahmad: Women and Gender in Islam, p.51) حضرت عائشہؓ ایک آسان ہدف تھیں۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ آں حضرتؐ کی چہیتی بیوی ہیں۔ حضرت عائشہؓ خوبصورت، چاق و چوبند، اپنی نمایاں حیثیت پر احساس تفاخر سے سرشار، حاسد، بے باک اور خود بین خاتون تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دشمن بھی بہت زیادہ تھے۔ حضورؐ نے اس مرتبہ قریش کے اس اتحادی قبیلے کے خلاف مہم میں حضرت عائشہؓ کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا جس نے معمول سے ہٹ کر مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ آں حضرتؐ کے جاسوسوں کے مطابق قریش نے اس قبیلے کو نخلستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ ایک کامیاب غزوہ تھا۔ مسلمانوں نے بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع مریسیع کے چشمے پر انہیں روک لیا۔ اس مہم میں

Marfat.com

دوسواونٹ اور پانچ سو بھیڑ بکریاں مال غنیمت میں ہاتھ آئیں اور دوسو عورتوں کو قیدی بنالیا گیا جن میں قبیلے کے سردار کی بیٹی جویریہؓ بنت حارث بھی شامل تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے جویریہؓ کو، جو بے حد حسین اور ملیح تھیں، دیکھا تو ان کا دل ڈوب گیا اور ان کی آنکھیں جویریہ کے چہرے پر گڑ گئیں۔ غزوے کے بعد جو مذاکرات ہوئے، ان میں رسول اللہؐ نے جویریہؓ کے ساتھ شادی کی تجویز پیش کر کے ان کے والد کے ساتھ اتحاد پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

مسلمان تین دن تک مریسیع میں ٹھہرے رہے لیکن غزوے کے مثبت نتائج کے باوجود مہاجرین اور انصار کے درمیان دبی ہوئی کشیدگی کے نتیجے میں ایک سنگین واقعہ رونما ہو گیا جس سے پوری امت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ مسلمان ایک کنوئیں سے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے کہ مختلف قبیلوں کے دو افراد کسی معمولی بات پر آپس میں جھگڑ پڑے۔ ان میں سے ایک قریش اور دوسرا خزرج کا اتحادی تھا۔ دونوں قبیلوں کے افراد نے امداد کے لیے قریش اور خزرج کو آواز دے دی۔ مہاجرین اور انصار نے اس قبائلی چیلنج پر فوری ردعمل ظاہر کیا اور چند ہی منٹوں میں قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمان، مسلمان کے ساتھ لڑنے لگا۔ حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ یہ خبر سنتے ہی موقعے پر پہنچ گئے اور معاملے کو رفع دفع کرا دیا لیکن ابن ابی سخت غضبناک ہو کر کہنے لگا: ''خدا کی قسم! جب ہم واپس مدینہ پہنچ جائیں گے تو ان میں جو زیادہ طاقت اور غلبے والے ہیں، وہ اپنے سے کمزور کو یقینی طور پر نکال دیں گے۔'' ایک انصاری نے آں حضرتؐ کو فوری طور پر ابن ابی کی اس دھمکی سے آگاہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فوراً تلوار نکال لی۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''عمر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۲۶: The Life of Muhammad, p.491)۔ حضورؐ نے فوراً کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو شدید گرمی میں سفر کرنا پڑتا حالانکہ اس سے پہلے آپؐ نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

واپسی پر ایک پڑاؤ کے دوران حضرت عائشہؓ کو رفع حاجت کے لیے جانا پڑا اور جب وہ واپس آئیں تو قافلہ کوچ کی تیاری کر رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے گلے کا ہار گر گیا ہے اور انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ یہ ہار ان کی والدہ نے شادی کے موقعے پر تحفے میں دیا تھا اور انہیں اس کا کھونا گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے واپس چلی گئیں۔ اس دوران وہ لوگ، جو ان کا کجاوا باندھنے اور رکھنے کے لیے متعین تھے، کجاوے کو پہلے سے ہی کس چکے تھے۔ انہوں نے یہ خیال کر کے کہ حضرت عائشہؓ حسب معمول ہودج میں موجود ہیں، اسے اونٹ پر رکھ کر باندھ دیا اور ذرا یہ شک نہ کیا کہ وہ اس میں موجود نہیں۔ انہوں نے اونٹ کا سر پکڑا اور چل دیے۔ حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں واپس آئیں تو یہاں نہ کوئی بلانے والا تھا اور نہ کوئی جواب دینے

Marfat.com

والا! سب لوگ جا چکے تھے۔ اسی دوران صفوانؓ بن معطل وہاں آ گئے اور وہ حضرت عائشہؓ کو اونٹ پر بٹھا کر اگلی منزل پر لشکر گاہ میں جا پہنچے۔ اس کے بعد منافقین نے ان کے بارے میں پرانی افواہیں دوبارہ پھیلانا شروع کر دیں اور رسول اللہؐ کے دشمن اس فرضی قصے کو اچھالنے لگے۔ ابن ابی ان سب میں پیش پیش تھا۔ اس اسکینڈل نے مدینہ کو ہلا کر رکھ دیا یہاں تک کہ نہ صرف بعض مہاجرین بلکہ حضرت عائشہؓ کے والد حضرت ابوبکرؓ بھی یہ گمان کرنے لگے کہ ممکن ہے یہ کہانی درست ہو۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قصے کو سن کر سنجیدہ ہو گئے اور آپؐ بھی حضرت عائشہؓ کی بے گناہی پر شک کرنے لگے۔ اس انتہائی مشکل دور میں آپؐ کی افسردگی کی یہ واضح علامت تھی۔ آں حضرتؐ چند روز تک بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہے اور کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔ حضرت عائشہؓ آپؐ کی ضرورت تھیں اور انہیں کھو دینے کا خیال پریشان کن تھا اس لیے آپؐ تذبذب اور الجھنوں کا شکار ہو گئے۔ اس ضمن میں خدا کی طرف سے کوئی وحی بھی نازل نہیں ہو رہی تھی، ربانی آواز خاموش تھی اور آپؐ کے پورے پیغمبرانہ کیریئر کے دوران اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا۔ ابن ابی صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور پرانی قبائلی نفرتوں نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ابن ابی کے قبیلے خزرج نے اوس کے خلاف جنگ کی دھمکی دے دی کیونکہ قبیلہ اوس کا استدلال یہ تھا کہ اس اسکینڈل کے ذمے دار تمام لوگوں کے سر فوری طور پر قلم کر دیے جائیں۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی کہ حضورؐ کو مدینہ کے تمام سرداروں کا ایک اجلاس بلانا پڑا تاکہ اس سازش کے سرغنہ ابن ابی کے خلاف کارروائی کی صورت میں ان کی حمایت حاصل کی جا سکے۔

آخر حضورؐ حضرت عائشہؓ کے پاس چلے گئے جنہوں نے اپنے والدین کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی۔ وہ دو دن سے مسلسل رو رہی تھیں لیکن جیسے ہی انہوں نے اپنے شوہر کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، ان کے آنسو خشک ہو گئے اور وہ پرسکون ہو گئیں۔ آں حضرتؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اگر وہ کسی برائی میں پڑی ہیں، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں تو انہیں اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ ۱۴ سالہ عائشہؓ نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت باوقار انداز میں جواب دیا، انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! جس چیز کا آپؐ نے ذکر کیا ہے، اس کے بارے میں میں تو کبھی اللہ سے توبہ نہ کروں گی۔ خدا کی قسم! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر میں لوگوں کی کہی بات کا اقرار کروں گی اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو میں ایسی بات کہوں گی جو بالکل بے وجود ہے اور اگر میں ان کی بات کا انکار کروں گی تو آپ لوگ مانیں گے نہیں۔ میں تو وہی کہوں گی جو ابو یوسفؑ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا تھا: صبر جمیل کے سوا کیا ہو سکتا ہے اور جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو، اس پر اللہ ہی کی مدد طلب کی جا سکتی ہے۔''

Marfat.com

(اور یوسفؑ کے کرتے کو جھوٹ موٹ کے خون سے آلودہ بھی کر لائے تھے، باپ نے کہا یوں نہیں بلکہ تم نے اپنے دل ہی سے ایک بات بنالی ہے پس صبر ہی بہتر ہے، اور تمہاری بنائی ہوئی باتوں پر اللہ ہی سے مدد کی طلب ہے۔ سورہ یوسف آیت ۱۸۔ مترجم)۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔

رسول کریمؐ حضرت عائشہؓ کو پوری طرح جانتے تھے اور آپؐ ان کی باتوں سے یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے کیونکہ جیسے ہی انہوں نے گفتگو ختم کی تو آپؐ پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس میں وحی نازل ہوتی تھی۔ اس روز شدید سردی تھی، اس کے باوجود آپؐ پسینے سے شرابور ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے سر کے نیچے چمڑے کا ایک تکیہ رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور ان کی بیوی خوف زدہ ہو کر خدائی فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ ''عائشہ! خوش خبری سن لو۔'' آں حضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہاری برأت نازل کر دی ہے۔'' یہ سنتے ہی حضرت عائشہؓ کے والدین نے خوش ہو کر ان سے کہا کہ وہ اٹھ کر حضورؐ کا شکریہ ادا کریں لیکن حضرت عائشہؓ نے درشتگی سے کہا: ''میں نہ تو آپؐ کے پاس آؤں گی اور نہ آپؐ کا شکریہ ادا کروں گی، نہ ہی میں تم دونوں کی شکر گزار ہوں گی جنہوں نے جھوٹی تہمت کو سنا اور اس کی تردید نہ کی۔ میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۳۵)۔ اس گلے شکوے کو قبول کرتے ہوئے رسول کریمؐ باہر نکل گئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ آپؐ نے وہ نئی آیات پڑھ کر سنائیں جن میں حضرت عائشہؓ کو بری الذمہ قرار دیا گیا اور بہتان لگانے والوں کی مذمت کی گئی۔ (جو لوگ یہ بہت بڑا بہتان باندھ لائے ہیں یہ بھی تم میں سے ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ یہ تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہاں ان میں سے ہر ایک شخص پر اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو انجام دیا ہے، اس کے لیے عذاب بھی بہت ہی بڑا ہے۔ سورہ النور آیت ۱۱۔ مترجم)۔ ایک ذاتی اور سیاسی المیہ ٹل گیا لیکن شکوک و شبہات موجود رہے۔ اس پریشان کن واقعے سے ظاہر ہو گیا کہ رسول کریمؐ کس قدر کمزور اور غیر محفوظ تھے۔ کیا آپؐ، جیسا کہ ابن ابی نے سفاکانہ انداز میں کہا تھا، ایک بجھی ہوئی آگ تھے؟

لیکن مارچ ۶۲۸ عیسوی میں جب مکہ میں حج کا مہینہ آیا تو رسول اللہؐ نے ایک ایسا چونکا دینے والا اعلان کر دیا جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ بصیرت کا غیر معمولی اظہار ہوتا تھا۔ (Lings: Muhammad, pp.247-55; Andrae: Muhammad, pp.219-27; Watt: Muhammad at Medina, pp.46-59, -234-35; Mohammad A. Bamyeh: The Social Origins of Islam, pp.222-27) یوں لگتا ہے کہ شروع میں آپؐ کے ذہن میں اس منصوبے کا کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا بلکہ آپؐ اپنی چشم بصیرت سے اس پلان کی ہلکی سی جھلک دیکھ رہے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ آپؐ نے یہ عجیب و غریب خواب

Marfat.com

دیکھا ہے کہ آپؐ حج کے لیے بال منڈوائے، حاجیوں کے روایتی لباس میں ملبوس خانہ کعبہ میں کھڑے ہیں اور کعبۃ اللہ کی چابی آپؐ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ قریش پر کھلی فتح کی علامت تھی۔ اگلی صبح آں حضرتؐ نے اعلان کر دیا کہ آپؐ حج کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ صحابہؓ نے جب یہ غیر معمولی اعلان سنا تو ان میں خوف، حیرت اور مسرت و شادمانی کا جو احساس پیدا ہوا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حضورؐ نے واضح کر دیا کہ یہ کوئی عسکری مہم نہیں ہے۔ حج کے دوران ہتھیار لے کر چلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مکہ کے تقدس اور احترام کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی جہاں ہر قسم کی لڑائی پر پابندی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ہتھیاروں کے بغیر مکہ جانے پر اعتراض کیا۔ کیا مسلمان بھیڑ کے بچوں کی طرح مکہ جائیں گے کہ انہیں ذبح کیا جا سکے؟ مسلمانوں کے پاس اپنے دفاع کے لیے ہتھیار موجود ہونے چاہییں۔ لیکن رسول خداؐ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے۔ ''میں ہتھیار لے کر نہیں جاؤں گا۔'' آپؐ نے مضبوط لہجے میں کہا: ''میں صرف فریضہ حج ادا کرنے جا رہا ہوں۔'' عازمین صرف روایتی سفید لباس پہنیں گے اور راستے میں شکار کے لیے صرف ایک چھوٹا چاقو ساتھ رکھیں گے البتہ مناسک حج ادا کرتے وقت اسے بھی ایک طرف رکھ دیا جائے گا۔'' مسلمانوں کو ہتھیاروں کے بغیر دشمن کے علاقے میں جانا پڑے گا!

نبی کریمؐ کے اتحاد میں شامل ہونے والا کوئی بھی خانہ بدوش قبیلہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا تاہم کوئی ایک ہزار مہاجرین اور انصار رضا کارانہ طور پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ ابن ابی اور بعض دوسرے منافقین نے بھی مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دو انصار خواتین کو بھی، جو بیعت عقبہ کے موقعے پر موجود تھیں، مکہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ حضرت ام سلمہؓ رسول کریمؐ کے ہمراہ تھیں۔

مسلمان فریضہ حج ادا کرنے کے بعد قربانی کے لیے اونٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ آں حضرتؐ نے ابتدائی قدم کے طور پر ایک اونٹ کی روایتی قربانی دی۔ اس اونٹ کو خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا، اس کی گردن میں ہار ڈالے گئے اور اس کا منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے حج کے کلمات بلند آواز سے ادا کیے اور کہا: ''لبیک اللّٰھم لبیک!'' اس دلیرانہ مہم کی خبر تیزی کے ساتھ ایک سے دوسرے قبیلے میں پھیل گئی اور جب عازمین نے جنوب کی سمت سفر شروع کیا تو خانہ بدوش بڑی دلچسپی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے لگے۔ رسول اللہؐ جانتے تھے کہ آپؐ نے قریش کو نہایت مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ ہر عرب کو حج کرنے کا حق حاصل تھا اور اگر کعبۃ اللہ کے پاسبان قریش نے ایک ہزار افراد کو، جو حدود حرم میں داخلے کے وقت پورے تقدس کے ساتھ مناسک ادا کر رہے تھے، خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو وہ اپنے فرض سے بدترین لاپروائی کے مرتکب ہوتے۔ لیکن اگر رسول خداؐ حرم میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس سے بھی قریش کی

Marfat.com

ناقابل برداشت تذلیل ہوتی۔ چنانچہ یہ بات جلد ہی واضح ہوگئی کہ قریش کی قیادت نے حضورؐ کو ہر قیمت پر روکنے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔ اس نئی صورت حال پر غور کرنے کے لیے قریش کے سرداروں کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں خالد بن ولید کی قیادت میں دوسو سواروں کے ایک دستے سے نہتے عازمین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

رسول اکرمؐ نے جب یہ خوفناک خبر سنی تو آپؐ کو اپنے قبیلے کی اس کارروائی پر سخت صدمہ ہوا۔ قریش نفرت کی آگ میں اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ اپنے پورے طرز زندگی کے مقدس اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کو تیار تھے۔ اس ضد اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج تھا؟ ''قریش کا برا ہو۔'' حضورؐ نے فرمایا: ''انہیں تو جنگ کھا گئی ہے! اگر وہ اس معاملے کو مجھ پر اور عربوں پر چھوڑ دیں تو ان کا کیا بگڑتا۔ اگر عرب مجھے ہلاک کر دیں گے تو قریش کا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے عربوں پر غالب کر دے گا تو وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اگر وہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے تو جب تک ان میں قوت ہوگی، جنگ کریں گے۔ پھر قریش کس خیال میں ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس مقصد کے لیے برابر جہاد کرتا رہوں گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے تا آنکہ وہ ذات پاک اسے غالب کر دے یا میری موت آ جائے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۱۷: The Life of Muhammad, p.500)۔ عازمین کو محفوظ طور پر حرم میں پہنچانا آپؐ کا سب سے اہم فریضہ تھا۔ مسلمانوں نے دوست بدوی قبیلے بنو اسلم کے ایک گائیڈ کی خدمات حاصل کر لیں جو انہیں ایک سنگلاخ راستے سے تنگ گھاٹیوں سے ہوتا ہوا اس علاقے میں لے گیا جہاں ہر قسم کے تشدد کی ممانعت ہے۔ آں حضرتؐ جیسے ہی اس مقدس علاقے میں داخل ہوئے، آپؐ نے عازمین کو یاد دلایا کہ وہ ایک دینی فریضہ ادا کر رہے ہیں اور انہیں واپس گھر آنے کی خوشی سے مغلوب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ فتح کا جشن منانے کا وقت نہیں بلکہ انہیں اپنے گناہوں پر توبہ و استغفار کرنی چاہیے۔ آپؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حدیبیہ کے کنوئیں کی طرف روانہ ہو جائیں اور اونٹوں کے پاؤں سے ریت اڑائیں تا کہ خالد اور ان کے آدمیوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں؟

جب آپؐ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو حضورؐ کی اونٹنی قصویٰ اچانک گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ صحابہ کرامؓ نے اس کے گرد کھڑے ہو کر معمول کے مطابق اسے اٹھانے کی پوری کوشش کی لیکن قصویٰ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس پر آں حضرتؐ نے فرمایا: ''یہ جمی نہیں، یہ اس کی عادت نہیں لیکن اسے اس پاک ہستی نے روک دیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ آج قریش کسی بھی چیز کی طرف مجھے دعوت دیں جو صلہ رحمی اور قرابت داری پر مبنی ہو تو میں وہ چیز انہیں دیے بغیر نہ رہوں گا۔'' (محمد ابن اسحاق:

Marfat.com

سیرت رسول اللہ صفحہ ۷۴۱)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش کو تباہ کرنے کا کبھی منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ آپؐ اس سماجی نظام میں اصلاح کرنا چاہتے تھے جس کے بارے میں آپؐ کو یقین تھا کہ یہ سسٹم مکہ کو برباد کر دے گا۔ قریش کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا حج اعلان جنگ ہے لیکن قصویٰ کی طرح آں حضرتؐ نے بھی مکہ کی تقدیس کے سامنے سربسجود ہونے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ جنگ سے کوئی دیرپا مقصد حاصل نہیں ہوا تھا اور اس میں فریقین نے ایک دوسرے پر سنگین زیادتیاں کی تھیں۔ یہ دشمن پر حملہ نہیں، ایک پرامن یلغار تھی۔

لیکن بہت کم مسلمانوں نے سنجیدگی سے حضورؐ کی باتوں پر توجہ دی۔ یہ لوگ اس ڈرامے اور جوش وخروش کے نتیجے میں کسی غیر معمولی کامیابی کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے! ممکن ہے کہ وہ فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہو کر قریش کو وہاں سے نکال دیں۔ لیکن حضورؐ نے نہایت پرسکون لہجے میں صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں کو پانی پلا کر ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد وہ ہوا جسے ''دھرنا'' کہتے ہیں۔ آں حضرتؐ کسی تشدد کے بغیر مکہ شہر میں داخل ہونے کی اجازت کا انتظار کر کے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ آپؐ عرب روایات پر ان قریش کے مقابلے میں کہیں زیادہ سختی سے کاربند ہیں جو حرم پاک کی سرزمین کی طرف سفر کے دوران غیر مسلح حالت میں آپؐ کو قتل کرنے کے درپے تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خانہ بدوشوں کو آخرکار آپؐ کا یہ پیغام مل گیا۔ قبیلہ خزاعہ کا سردار، جو مکہ گیا ہوا تھا، حدیبیہ پہنچ گیا تاکہ یہ دیکھ سکے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ اسے یہ سن کر سخت دھچکا لگا کہ عازمین کو خانہ کعبہ جانے سے روک دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ قریش سے احتجاج کرنے کے لیے واپس مکہ چلا گیا۔ مکہ کو ہمیشہ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے، اس نے حرم میں تمام عربوں کا خیر مقدم کیا ہے اور اس میں آباد تمام مذاہب کے لوگ اس کی تجارتی کامیابی کا سبب بنے رہے ہیں۔ اب وہ کس ڈگر پر چل رہے تھے؟ قبائلی سردار نے قریش سے استفسار کیا کہ انہیں ایک ایسے آدمی کو حج سے روکنے کا کوئی حق حاصل نہیں جو پرامن حالت میں چل کر یہاں آیا ہے۔ لیکن قریش کے سردار اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگے۔ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور کعبے کے درمیان کھڑے رہے اور اپنے آخری آدمی کے قتل ہونے تک جنگ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ ''ممکن ہے کہ وہ جنگ کرنے یہاں نہ آیا ہو۔'' قریش کے سردار چلا کر کہنے لگے: ''لیکن خدا کی قسم! وہ ہماری مرضی کے بغیر مکے میں کبھی داخل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی عرب کبھی یہ کہیں گے کہ ہم نے اس کی اجازت دی ہے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۳)۔

اس مرحلے پر سہیل نے، جو ایک پاکباز مشرک تھا اور جس کے بارے میں حضورؐ کو توقع تھی کہ وہ اسلام قبول کر لے گا، مکہ کی طرف سے رسول اللہؐ کی مزاحمت کی قیادت کی۔ اس کے علاوہ اسلام کے بعض ابتدائی مخالفین کے بیٹے بھی پیش پیش تھے۔ ان میں عکرمہ بھی شامل تھا جو اپنے باپ ابوجہل کی طرح کسی قسم کے

Marfat.com

سمجھوتے کے سخت خلاف تھا۔ اسی طرح بدر میں مارے جانے والے امیہ کا بیٹا صفوان بھی قریش مکہ کی قیادت کر رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوسفیان نے حدیبیہ میں کوئی کردار ادا نہ کیا۔ وہ حد درجہ ذہین شخص تھا اور اس نے غالباً یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش کو ایک مشکل اور ہراساں کرنے والی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے اور یہ کہ اب آپؐ کے ساتھ جاہلیت کے روایتی سرکشی کے طریقوں سے نمٹا نہیں جا سکتا۔

اہل مکہ نے عازمین کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن رسول اللہؐ انہیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ان کی مہم کا اگلا ہدف یہ تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ابن ابی کو پیغام بھیجا اور اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے کی دعوت دی۔ لیکن ابن ابی کے اس جواب سے سب کو حیرت ہوئی کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے کعبے کا طواف نہیں کر سکتا۔ اگلے برسوں میں وہ پھر حضورؐ کے خلاف ہو گیا لیکن حدیبیہ میں وہ ایک وفادار مسلمان ثابت ہوا۔ صفوان اور سہیل نے عکرمہ کو مذاکرات کرنے پر آمادہ کر لیا جس کے بعد انہوں نے اپنے اتحادی بدو قبیلے بنو حارث کے سردار حلیس بن علقمہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آں حضرتؐ کے پاس بھیجا۔ جب آپؐ نے حلیس کو اپنی جانب آتے دیکھا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے کہا کہ قربانی کے اونٹ حلیس کے پاس لے جاؤ تا کہ وہ انہیں دیکھ لے۔ حلیس نے خوبصورتی کے ساتھ سجائے گئے اونٹوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رسول کریمؐ کے ساتھ ملاقات بھی نہ کی اور فوراً قریش کے پاس واپس چلا گیا۔ اس نے رپورٹ دی کہ مسلمان واقعی حج کرنے کی غرض سے آئے ہیں اور انہیں حرم میں داخلے کی فوری طور پر اجازت ملنی چاہیے۔ یہ سن کر صفوان مشتعل ہو گیا۔ ایک جاہل بدوی انہیں یہ حکم دینے کی کیوں کر جرأت کر سکتا ہے؟ یہ اس کی سنگین غلطی تھی چنانچہ حلیس نے اٹھ کر نہایت باوقار انداز میں کہا:

''اے گروہ قریش! خدا کی قسم! اس بات پر ہم تم ایک دوسرے کے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہمارا تمہارا معاہدہ ہوا تھا کہ جو شخص بیت اللہ کی زیارت اور اس کے اکرام کے لیے آیا ہو، اسے روکا جا سکتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں حلیس کی جان ہے! یا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس مقصد کے لیے آئے ہیں، انہیں پورا کرنے دو یا میں تمام حبشیوں کو لے کر ایک ساتھ الگ ہوتا ہوں۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۳)۔

صفوان نے حلیس سے فوراً معافی مانگ لی اور اس سے کہا کہ جب تک اس مسئلے کا اطمینان بخش حل تلاش نہیں کر لیا جاتا، وہ ان کے ساتھ رہے۔

قریش کا دوسرا ایلچی مکہ کا اتحادی اور طائف کا عروہ ابن مسعود تھا۔ اس نے رسول کریمؐ کی کمزوری کو

Marfat.com

بھانپتے ہوئے فوراً کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قریش سر سے پاؤں تک ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنی عورتوں اور بچوں کے ہمراہ نکل آئے ہیں۔ کیا تم گوناگوں قسم کے ان لوگوں کو مقابلے کے لیے لے کر آئے ہو جن میں سے کئی قبیلے ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف شدید جنگیں لڑتے رہے ہیں۔ خدا کی قسم! کل لڑائی کا رخ بدلا تو یہ تمہیں چھوڑ جائیں گے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۵)۔ حضورؐ جانتے تھے کہ طاقت اور یک جہتی کے مظاہرے کے باوجود آپؐ کے قابل اعتماد اتحادیوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ آپؐ کے خانہ بدوش اتحادی، جنہوں نے حج کے لیے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا، مصنوعی طور پر اسلام سے مخلص تھے۔ اس کے علاوہ مدینہ میں آپؐ کی پوزیشن غیر محفوظ تھی۔ آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپؐ جو کچھ کرنے والے تھے، آپؐ کے بعض انتہائی قریبی ساتھی بھی اسے سمجھ نہیں پائیں گے۔ آپؐ مختلف النوع لوگوں کی اس بھیڑ کے ساتھ اپنے قبیلے قریش کا کس طرح مقابلہ کر سکیں گے؟ اس کے برعکس قریش پوری طرح متحد اور مسلح تھے اور ان کی عورتوں اور بچوں تک نے آپؐ کو خانہ کعبہ سے روکنے کا عہد کر رکھا تھا۔ بہ ہر حال عروہ اس بحران میں مسلمانوں کی اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ والہانہ عقیدت کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا اور اس نے قریش کو بتایا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان پر بالادستی حاصل کر لیں گے اس لیے انہیں حضورؐ کے ساتھ کوئی سمجھوتا کر لینا چاہیے۔

اب رسول کریمؐ نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپؐ نے ایک انصاری کو اس خیال سے مکہ بھیجا کہ اس سے زیادہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن قریش نے اس کے اونٹ کے پاؤں کی نس کاٹ کر اسے ناکارہ بنا دیا اور اگر حلیس کے قبیلے کے لوگ مداخلت نہ کرتے تو وہ اسے قتل کر ڈالتے۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ سے مکہ جانے کے لیے کہا لیکن ان کے قبیلے کا کوئی بھی طاقتور شخص مکہ میں موجود نہیں تھا جو ان کی حفاظت کرتا۔ چنانچہ یہ مشن حضرت عثمانؓ بن عفان کو سونپنے کا فیصلہ کر لیا گیا کیونکہ مکہ میں بہت سے اشراف کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کی باتوں کو غور سے سنا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا البتہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو خانہ کعبہ کا طواف کرنے کی اجازت دے دی تاہم انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو یرغمال بنا کر مسلمانوں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

یہ ایک خوفناک لمحہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ مہم ایک المناک انجام پر منتج ہوگی۔ اس حالت میں حضورؐ پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی لیکن اس مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی اور آپؐ کو اس مسئلے کا حل خود تلاش کرنا پڑا۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی آپؐ روحانی وجدان کی مدد سے خوفناک واقعات کا بغور جائزہ لینے لگے۔ آخر آپؐ نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ وفاداری اور اطاعت شعاری کا خصوصی عہد

Marfat.com

کریں۔ رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ کو بیعت کرنے کی دعوت دی، یہی وہ بیعت رضوان ہے جو ایک درخت کے نیچے لی گئی تھی۔ مختلف راویوں نے اس واقعے کی مختلف تشریح کی ہے لیکن واقدی کا بیان غالباً سب سے درست ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس موقعے پر ہر مسلمان نے حضورؐ کا دست مبارک تھام کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس بحران میں ہر بات میں آں حضرتؐ کی کامل اطاعت کرے گا۔ (Watt: Muhammad at Medina, p.507)۔ رسول کریمؐ کو مکمل اطاعت گزار لوگوں کی کبھی بھرپور حمایت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سن کر ابن ابی اور منافقین بھی بیعت کرنے کو تیار ہو گئے۔ نبی کریمؐ نے داخلی بصیرت کی مدد سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ آپؐ جو لائحہ عمل اختیار کرنے والے ہیں، آپؐ کے بہت سے ساتھیوں کے لیے وہ ناقابل برداشت ہوگا چنانچہ آپؐ نے ان صحابہؓ سے پیشگی بیعت لے لی۔ جب ہر شخص نے حلف اٹھا لیا تو صورت حال بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے یہ اچھی خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے۔ پھر حضورؐ نے سہیل کو، جس کا آپؐ ہمیشہ احترام کرتے تھے، اپنی طرف آتے دیکھا تو آپؐ نے محسوس کر لیا کہ قریش اب سنجیدہ بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

یہ بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ آخر حضورؐ نے قریش کو اپنے بارے میں سنجیدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح پرامن حل کے حقیقی امکانات پیدا ہو گئے۔ آں حضرتؐ دیر تک سہیل کے ساتھ بیٹھے رہے لیکن ان مذاکرات کے نتیجے میں صلح کے لیے جو شرائط طے ہوئیں، انہیں جان کر بہت سے صحابہؓ کو سخت مایوسی ہوئی۔ سب سے پہلے آپؐ نے یہ وعدہ کر لیا کہ آپؐ طواف کعبہ کیے بغیر واپس مدینہ چلے جائیں گے البتہ سہیل نے یہ عہد کیا کہ اگلے سال مسلمان مکہ کے حدود کے اندر مناسک حج ادا کر سکیں گے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ قریش کا جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے ولی کی اجازت کے بغیر ہجرت کر کے مدینہ جائے گا، رسول اللہؐ اسے واپس کر دیں گے لیکن حضورؐ کے ساتھیوں میں سے جو آدمی مدینہ سے قریش کے پاس جائے گا، وہ اسے واپس نہیں کریں گے نیز بدو قبیلوں کو اپنے سابق عقد و عہد سے سبک دوش کر دیا گیا اور اب وہ مدینہ یا مکہ دونوں میں کسی ایک کے ساتھ اتحاد قائم کر سکیں گے۔

قرآن کریم بہت پہلے یہ اعلان کر چکا تھا کہ مسلمانوں کو قیام امن کی خاطر دشمن کی جانب سے پیش کی جانے والی کسی بھی شرط کو، خواہ وہ بظاہر نقصان دہ ہو، قبول کر لینا چاہیے۔ (ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آ جائے، اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔ سورہ البقرہ آیت ۱۹۳۔ مترجم)۔ لیکن بہت سے عازمین نے یہ محسوس کیا کہ یہ شرائط توہین آمیز ہیں۔ امن کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان اب مکہ کے تجارتی قافلوں پر حملہ نہیں کر سکیں گے۔ رسول کریمؐ اس

Marfat.com

اقتصادی ناکہ بندی کو کیوں ترک کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اہل مکہ مسلمانوں کی گرفت میں آنا شروع ہو گئے تھے؟ آپؐ نے نومسلموں کو واپس مکہ بھیجنے پر کیوں آمادگی ظاہر کی ہے جب کہ قریش اس قسم کے تبادلے کے پابند نہیں ہوں گے؟ پچھلے پانچ برسوں کے دوران کئی مسلمان اسلام پر اپنی جانیں نچھاور کر چکے تھے، کئی مسلمانوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور دین کی خاطر اپنے خاندانوں اور دوستوں کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب حضورؐ ان فوائد کو بڑے سکون کے ساتھ قریش کو واپس کر رہے تھے۔ اب عازمین کو عجز و انکسار کے ساتھ حج کے مسئلے پر دباؤ تک ڈالے بغیر اپنے گھروں کو واپس چلے جانا چاہیے۔ اس معاہدے میں ہر جاہلی جبلت سے علیحدگی اختیار کر لی گئی تھی۔ ''صحابہ کرامؓ کو پوری امید تھی کہ آں حضرتؐ کے خواب کے مطابق وہ مکہ پر فتح حاصل کر لیں گے''۔ محمد ابن اسحاق نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ''لیکن جب انہوں نے امن کے لیے مذاکرات اور صلح نامے کی شرطوں کو دیکھا تو ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۷۴۸: The Life of Muhammad, p.505)۔

صلح حدیبیہ کے ردعمل میں بدترین بغاوت ہو گئی۔ اس خطرناک مہم کے دوران عازمین نے متحد ہو کر جس کمزور یک جہتی کو فروغ دیا تھا، صلح کی شرطوں سے اس کے پرخچے اڑ گئے اور وہ گہرے اختلافات، جو ہمیشہ سے امت میں موجود تھے، اچانک کھل کر سامنے آ گئے۔ معاہدے کی شرطوں کو سن کر حضرت عمرؓ طیش میں آ گئے۔ وہ تیزی کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا: ''کیا ہم مسلمان اور وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر ہمارے دین کے معاملے میں ہمیں یہ ذلت کیوں دی جا رہی ہے؟'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۷)۔ معاہدے سے حضرت ابوبکرؓ بھی پریشان ہو گئے تاہم انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا: ''عمر! رسول اللہؐ کا دامن تھامے رکھو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔'' حضرت عمرؓ نے بعد میں بتایا کہ اگر اس موقعے پر ایک سو آدمی بھی میرا ساتھ دیتے تو میں امت سے منحرف ہو جاتا۔ حدیبیہ میں وہ حضورؐ کے وژن کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ (Bamyeh: Social Origins of Islam, pp.226-27)۔ مدینہ کے بے شمار مسلمانوں اور قریش کے بے کس اور نادار مہاجرین کی طرح وہ صرف مکہ کے سماجی نظام میں اصلاح کے خواہاں نہیں تھے بلکہ وہ اس نظام کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ خالص قرآنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ جناب عمرؓ ایک دلیر اور مخلص انسان اور انصاف اور مساوات کے ان اصولوں کے سرگرم علمبردار تھے جن کا مکہ میں فقدان تھا۔ لیکن وہ عربوں کے حلم کے نظریے پر کاربند نہیں تھے اور ان میں جاہلی دور کی تندخوئی اور آتشیں جوش اب بھی موجود تھا۔ وہ یہ بات سمجھ نہ پائے کہ بردباری اور عدم تشدد کی اقدار کو بھی مثالی اسلامی معاشرے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ جوش عمل سے سرشار انسان تھے جو معاملات پر غور و خوض کیے بغیر دور جاہلیت کی طرح تلوار کو میان سے نکالنے پر ہر وقت

Marfat.com

کمر بستہ رہتے۔ (Mernissi: Women in Islam, pp.184-86)۔ حدیبیہ میں اپنی پالیسی سے حضورؐ کے بظاہر انحراف پر عمرؓ حواس باختہ اور پریشان ہو گئے۔

غزوہ خندق میں قریش کو شکست دینے کے بعد حضورؐ کو انہیں مکمل طور پر تباہ کرنے کا پلان تیار کرنا چاہیے تھا لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مکہ کا زوال عرب کے لیے ناقابل تصور تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ عرب ایک پسماندہ علاقہ تھا اور اسے ان قریش کی تجارتی مہارت کی اشد ضرورت تھی جو اسلام سے دور قبائلی جنگوں، نفرت اور غصے کی حالت میں مسلمانوں سے برسر پیکار تھے۔ رسول خداؐ کو توقع تھی کہ وہ قریش کی اقتصادی ناکہ بندی ختم کر کے ان کے دل جیت لیں گے۔ آپؐ حدیبیہ میں وہ کچھ دیکھ رہے تھے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ آپؐ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؐ کیا کر رہے ہیں؟ آپؐ عربوں کے لیے ایک ایسے سیاسی اور مذہبی حل کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ عمومی توقعات کے برعکس کوئی کام کرتے کیونکہ اس صورت میں حالات جوں کے توں رہتے۔

رسول کریمؐ نے صحابہ کرامؓ کے افسردہ اور حیرت زدہ چہرے دیکھے تو آپؐ کو انہیں یہ بتانا پڑا کہ انہیں معاہدے کی شرطیں قبول کر لینی چاہییں کیونکہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اس سے وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے جو کسی معجزے کی توقع کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ منافقین کو بھی اس صورت حال سے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ یہ لوگ صرف دنیاوی فائدوں کے لیے امت میں شامل ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے معاہدے کے الفاظ سنے تو ماحول میں مزید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ رسول خداؐ نے حضرت علیؓ کو معاہدے کی دستاویز لکھنے کے لیے بلایا اور جب انہوں نے مسلمانوں کی روایت کے مطابق تحریر کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا تو سہیل نے فوراً اس پر اعتراض کیا۔ قریش کو اس قسم کے مقدس القابات سے نفرت تھی چنانچہ سہیل نے کہا: ''میں نہیں جانتا بلکہ لکھو باسمک اللّٰھم (اے خدا تیرے نام سے)۔'' حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوری طور پر جب یہ الفاظ لکھوانے پر آمادہ ہو گئے تو مسلمان سخت متعجب ہوئے۔ لیکن اس کے بعد بدترین صورت حال پیش آنے والی تھی۔ رسول اللہؐ نے اس کے بعد یہ لکھوایا: ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سہیل بن عمرو سے صلح کی۔'' سہیل نے ان الفاظ پر پھر اعتراض کیا، کہنے لگا: ''اگر میں اس بات کا اقرار کرتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ سے جنگ کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیے۔'' حضرت علیؓ ''اللہ کے رسول'' کے الفاظ پہلے لکھ چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان لفظوں کو عبارت سے نہیں کاٹ سکتے۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ چرمی کاغذ پر لکھے گئے ان لفظوں کی نشان دہی کر

Marfat.com

دیں۔اس کے بعد حضورؐ نے ان الفاظ کو اپنے دست مبارک سے کاٹ کر یہ الفاظ لکھوا دیے: ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد ابن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۷:The Life of Muhammad, p.504)۔

اس انتہائی مشکل مرحلے پر، جب معاہدے پر دستخط ہو رہے تھے، سہیل کا بیٹا ابوجندلؓ اچانک موقعے پر پہنچ گیا۔ابوجندلؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن سہیل نے انہیں ہجرت کر کے مدینہ جانے سے روکنے کے لیے اپنے مکان میں بند کر دیا تھا۔اب وہ فاتحانہ انداز میں کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کی غرض سے اس حال میں حدیبیہ پہنچ گئے کہ ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی تھیں۔یہ دیکھ کر سہیل نے اپنے بیٹے کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور انہیں گلے سے پکڑ لیا۔کیا حضورؐ معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے ابوجندلؓ کو اس کے سرپرست کے حوالے کر دیں گے؟ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بالکل نہ ڈگمگائے حالانکہ سہیل نے جب ابوجندلؓ کو واپس مکہ لے جانے کے لیے کھینچا تانی کی تو ابوجندلؓ نے چیختے ہوئے کہا تھا: ''اے مسلمانو! کیا میں مشرکوں کی طرف واپس جا سکتا ہوں جو میرے دین کو برباد کر دیں گے؟'' محمد ابن اسحاق نے کلاسیکل انداز میں بیان کیا ہے: ''اس واقعے سے مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب میں زبردست اضافہ ہو گیا۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۴۷:The Life of Muhammad, p.504)۔

حضرت عمرؓ کے لیے یہ آخری تنکا تھا۔وہ ایک مرتبہ پھر اچھل پڑے اور اس شخصیت کو چیلنج کرنے کی جسارت کر دی جس کی وہ پچھلے بارہ برسوں سے کامل اطاعت کر رہے تھے۔کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا مسلمان حق پر اور مشرک گمراہ نہیں؟ پھر ہمارے دین کے معاملے میں ہمیں کس بنا پر ذلت دی جا رہی ہے؟ کیا حضورؐ نے انہیں یقین نہیں دلایا تھا کہ وہ خانہ کعبہ میں دوبارہ خدا کی عبادت کریں گے؟ آں حضرتؐ نے اعتراف کیا کہ آپؐ نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا۔اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: لیکن کیا میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اسی سال خانہ کعبہ میں عبادت کریں گے؟ آپؐ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔میں اس کے حکم کی کسی صورت میں خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور وہ مجھے کسی طرح ضائع نہیں کرے گا۔(Lings: Muhammad, p.254)۔حضرت عمرؓ اگرچہ سخت پریشان تھے، اس کے باوجود انہوں نے حواس پر قابو پا لیا اور معاہدے پر دستخط کر دیے۔لیکن دوسرے عازمین ابھی تک مشتعل تھے اور ایک خطرناک لمحہ اس وقت آیا جب بظاہر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے بغاوت کر دی ہے۔رسول خداؐ نے اعلان کیا کہ گو وہ خانہ کعبہ تک نہیں پہنچ سکے تاہم وہ حدیبیہ میں حج کے مناسک ادا کریں گے۔جس طرح وہ مکہ میں سر کے بال منڈواتے اور قربانی کرتے ہیں، اسی طرح وہ حدیبیہ میں سر کے بال منڈوائیں اور اونٹوں کی قربانی

Marfat.com

دیں گے۔اس پر مکمل خاموشی چھا گئی اور عازمین نے سکوت اختیار کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ آپؐ کے حکم کی تعمیل نہیں کریں گے۔رسول کریمؐ مایوس ہو کر اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ آپؐ نے ام سلمہؓ سے پوچھا جو صورت حال کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر چکی تھیں۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر جا کر ایک لفظ بولے بغیر قربانی کے لیے مخصوص اونٹ کو ذبح کر دیں۔یہ بالکل صحیح فیصلہ تھا۔اونٹ کا خون بہنے کا منظر اس قدر اثر انگیز تھا کہ اس سے مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے۔اب تمام عازمین سر کے بال منڈوانے اور قربانی کرنے میں سبقت لینے کے لیے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔حضرت ام سلمہؓ بعد میں اس واقعے کو یاد کر کے فرمایا کرتی تھیں: ''مجھے ڈر محسوس ہوا کہ وہ اسی جوش وخروش میں مہلک زخم نہ لگوا بیٹھیں۔''

اب صحابہ کرامؓ واپس مدینہ روانہ ہوئے تو ماحول میں کشیدگی ختم ہو چکی تھی البتہ بعض لوگ ابھی تک رنجیدہ تھے۔رسول کریمؐ نے بھی فاصلہ برقرار رکھا اور خیالوں میں کھوئے رہے۔حضرت عمرؓ کو یہ ڈر تھا کہ ان کے باغیانہ رویے اور سرکشی کی وجہ سے حضورؐ کے ساتھ ان کی دوستی کو مستقل نقصان پہنچ سکتا ہے۔اچانک ایک ایلچی نے ان کے پاس آ کر کہا کہ آں حضرتؐ نے انہیں بلایا ہے۔اس سے ان کا دل ڈوب گیا۔لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ ان کے کندھوں سے اتر گیا ہے۔''مجھ پر خدا کی طرف سے ایک سورت نازل ہوئی ہے۔'' حضورؐ نے عمرؓ کو بتایا۔''اور یہ سورت مجھے اس سورج کے نیچے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔'' (Lings: Muhammad, p.255)۔یہ سورہ الفتح تھی جس میں حدیبیہ میں پیش آنے والے تمام واقعات کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ واضح یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ حدیبیہ میں نبی کریمؐ کو سفارتی شکست نہیں ہوئی بلکہ خدا نے آپؐ کو کھلم کھلا فتح دی ہے۔خدا نے امن اور صلح کے جو ہر سکینہ کو آپؐ پر نازل کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان اور سکون ڈال دیا۔سورہ الفتح میں کہا گیا ہے کہ جب نہتے مسلمان خانہ کعبہ کے طواف کی غرض سے ایک خطرناک مہم پر روانہ ہوئے تھے تو ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت موجود تھی اور وہ ان بدو قبائل سے ماورا تھے جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔صحابہ کرامؓ نے اپنے جذبہ ایمانی کا دوسری مرتبہ اس وقت اظہار کیا جب انہوں نے ببول کے درخت کے نیچے بیعت رضوان کے دوران آں حضرتؐ کے ساتھ عہد و پیمان باندھا تھا۔حدیبیہ میں بالآخر صلح کا جو معاہدہ ہوا، وہ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی جس سے خدا کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

حدیبیہ کی فتح نے مسلمانوں کو ان قریش سے ممتاز کر دیا جنہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اب بھی جاہلی دور کے نخوت وتکبر اور ضد پر قائم اور روایتی طرز زندگی کی قدروں سے چمٹے ہوئے ہیں۔وہ بے گناہ عازمین کے حرم میں داخل ہونے کی ''ذلت'' کو قبول کرنے کے بجائے ان کا قتل عام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

Marfat.com

جب کہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت کو جگہ دی اور حمیت بھی جاہلیت کی، سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقوے کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے اہل اور زیادہ مستحق تھے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (سورہ الفتح آیت ۲۶)۔

مسلمان کوئی جنگجو لوگ نہیں، حلم کے جذبے، امن اور صبر و استقلال سے سرشار تھے جو انہیں اہل کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کا حلیف بناتا تھا۔ وہ حدیبیہ میں قریش کی طرح سرکشی اور جارحیت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے نماز میں خدائے برتر کے سامنے عجز و انکسار کے ساتھ سربسجود تھے۔

تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ (سورہ الفتح آیت ۲۹)۔

یہ تشدد اور ہٹ دھرمی نہیں، رحم دلی، شائستگی اور آسودگی و طمانیت تھی جو امت کی نشو و نما اور تقویت کا باعث تھی۔ ''مثل اس کھیتی کے جس نے اپنا انکھوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا۔'' (سورہ الفتح آیت ۲۹)۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب یہ مقدس امن کا دور تھا۔

کارزارِ حیات میں جد و جہد کو تو جاری رہنا تھا لیکن تمام ذرائع کا کہنا ہے کہ صلح حدیبیہ اصل میں امن کی جانب پہلا قدم تھا۔ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے: ''حدیبیہ سے پہلے اسلام کو اتنی بڑی فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔'' فتح کا مصدر ہے کھولنا۔ شروع میں امن میں پیش رفت ممکن نظر نہیں آتی تھی لیکن اس صلح نے اسلام کے لیے نئے دروازے کھول دیے۔ ''اس سے پہلے جہاں بھی لوگ ایک دوسرے سے دوچار ہوتے تھے، جنگ ہو کر رہتی تھی لیکن جب یہ مصالحت ہوئی، جنگ روک دی گئی، لوگ ایک دوسرے سے مامون ہو گئے اور میل ملاپ کرنے لگے۔ باہم گفت و شنید اور تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام کے بارے میں بات کرتا اور اس کی سمجھ میں کوئی چیز آ جاتی تو وہ اسلام میں داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی جو تعداد تھی، اس کے برابر یا اس سے بھی زیادہ لوگ ان دو برسوں (۶۲۸ سے ۶۳۰ عیسوی) میں داخل اسلام ہوئے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۱۷: The Life of Muhammad, p.507)۔

قرآن کریم کی مترنم سورہ النصر غالباً اسی زمانے میں نازل ہوئی تھی:

جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے
اور تو لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق آتا دیکھ لے

Marfat.com

تو اپنے رب کی تسبیح کرنے لگ حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت کی دعا مانگ، بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے

اس فتح پر کوئی شادیانے نہیں بجائے جارہے تھے، نہ ہی انتقام لینے کے لیے شوروغوغا کیا گیا۔ امن اور صلح کے نئے دور کا آغاز شکرانے، معافی اور خود احتسابی سے ہونا چاہیے۔

صلح حدیبیہ سے جزیرہ نما میں اسلام کی پوزیشن مجموعی طور پر بہتر ہوگئی البتہ مدینہ میں رسول کریمؐ کی حیثیت پر اس کا بہت کم اثر پڑا۔ انصار اور مہاجرین پر مشتمل زائرین بدستور یہ محسوس کرتے رہے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ مہاجرین یہ سوال کرنے لگے کہ اگر وہ مکہ کے تجارتی کاروانوں پر حملہ نہ کر سکے تو اپنی روزی کیسے حاصل کریں گے؟ حضورؐ جانتے تھے کہ امن کوششوں کو نقصان پہنچائے بغیر ان لوگوں کی بے چینی اور اضطراب کا ازالہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے مسلمانوں کی توجہ شمال میں مکہ سے دور خیبر کی طرف مبذول کردی۔ جلاوطن یہودی قبیلہ بنونضیر اب بھی مسلمانوں کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا اور خیبر کے لیڈر دوسرے شمالی قبیلوں کو بھی حضورؐ کے خلاف جارحیت کی مسلسل ترغیب دے رہے تھے۔ رسول کریمؐ چھ سو کی نفری لے کر اس شہر کا محاصرہ کرنے کے لیے نکل پڑے۔ قریش نے جب یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی۔ مدینہ کی طرح خیبر بھی آتش فشاں پتھروں سے ڈھکے ہوئے میدانی علاقوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سات بڑے قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ خیبر کو ناقابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان یہودیوں کی اس داخلی کشمکش سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوگئے جو قبائلی روح کے انحطاط کی علامت تھی۔ مدینہ کی طرح خیبر کا ہر قبیلہ بھی خودمختار تھا لہٰذا محاصرے کے دوران وہ موثر طور پر ایک دوسرے سے تعاون نہ کر سکے۔ یہودیوں نے اپنے حلیف قبیلے بنوغطفان کو پیغام بھیجا لیکن وہ بھی ان کی مدد کو نہ پہنچے۔ اس طرح ایک مہینے کے محاصرے کے بعد معتبر یہودیوں نے امن کی درخواست کردی اور وہ مدینہ کی رعیت بن گئے۔ معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے حضورؐ نے اپنے دشمن، بنونضیر کے سردار حیی ابن اخطب کی ۱۷ سالہ خوبصورت بیٹی صفیہؓ کے ساتھ شادی کر لی۔ حضرت صفیہؓ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر خوش ہوئیں اور آں حضرتؐ نے سختی کے ساتھ یہ حکم دیا کہ ان کے والد کے بارے میں، جو محاصرے کے دوران انتقال کر گیا تھا، سخت ریمارکس ہرگز نہ دیے جائیں۔ آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو بتایا کہ اگر دوسری ازواج مطہراتؓ انہیں یہودی ہونے کا طعنہ دیں تو آپ ان سے کہیں کہ ہارونؑ میرے باپ اور موسیٰؑ میرے چچا تھے۔ (محمد ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر جلد ہفتم صفحہ ۱۴۷: Lings: Muhammad, p.275)۔ اس شادی سے مفاہمت اور عفو و درگزر کے اس رویے کی عکاسی ہوتی ہے جسے فروغ دینے کی آپؐ جدوجہد کر رہے

Marfat.com

تھے۔اب ماضی کی نفرت اور خوں ریزی کو موقوف کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

خیبر سے واپسی کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک پر مسرت خاندانی زندگی سے لطف اندوز ہوئے۔ حدیبیہ کے بعد آپؐ نے حبشہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کو ایک پیغام بھیجا جس میں ان سے کہا گیا کہ عرب کی صورت حال چونکہ بہتر ہوگئی ہے اس لیے اب وہ وطن لوٹ آئیں۔ چنانچہ آپؐ خیبر سے واپس آئے تو آپؐ کے چچا ابوطالب کے بیٹے حضرت جعفرؓ مدینہ میں آپؐ کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں آپؐ نے ۱۳ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اسی دوران حضورؐ نے ایک اور نئی بیوی کا خیر مقدم کیا۔ اس سال کے شروع میں آپؐ کو معلوم ہوا تھا کہ آپؐ کے پھوپھی زاد عبیداللہ بن جحش کا حبشہ میں انتقال ہوگیا ہے، چنانچہ حضورؐ نے ان کی بیوہ رملہؓ سے، جن کی کنیت ام حبیبہ تھی، شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نجاشی کے دربار میں حضورؐ کی غیر حاضری میں نکاح پڑھا گیا اور مسجد نبوی میں ان کے لیے ایک الگ حجرہ تیار کیا گیا۔ یہ ذہانت پر مبنی ایک اور سیاسی تحریک تھی کیونکہ ام حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔

سال کا بقیہ حصہ معمول کے غزووں میں گزرا۔ ان میں سے بعض مہمیں شمال کے نئے یہودی اتحادیوں کی درخواست پر بھیجی گئیں۔ پھر مارچ ۶۲۹ عیسوی میں ذی الحج کے مقدس مہینے میں نبی کریمؐ معاہدہ حدیبیہ کے مطابق عازمین کی ایک جماعت کے ہمراہ مکہ روانہ ہوگئے۔ اس مرتبہ ۲۶۰۰ صحابہ کرامؓ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ آپؐ جب حرم کے حدود میں داخل ہوئے تو قریش نے وعدے کے مطابق شہر کو خالی کر دیا۔ قریش کے سرداروں نے مکہ کے قریب واقع ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر یہ غیر معمولی منظر دیکھا۔ صحابہؓ کے بڑے مجمعے نے آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہونا شروع کیا اور وادی کی فضائیں اور مکہ کی گلیاں ''لبیک اللھم لبیک'' کی صداؤں سے گونج اٹھیں۔ قریش مسلمانوں کے نظم وضبط سے یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے۔ اس موقعے پر بے لگام مسرت وانبساط یا بے ہنگم شادمانی کا کوئی مظاہرہ نہ کیا گیا، نہ ہی قریش پر طعن وتشنیع کی گئی۔ اس کے بجائے صحابہ کرامؓ حسب معمول قصویٰ پر سوار رسول اللہؐ کی قیادت میں نہایت منظم انداز میں آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہوئے۔ جب آپؐ خانہ کعبہ میں پہنچ گئے تو آپؐ نے اونٹنی سے اتر کر حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور سات مرتبہ کعبۃ اللہ کا طواف کیا۔ وطن واپسی کا یہ عجیب منظر تھا! مہاجرین مکہ سے واپسی کے معاملے میں جذباتی تھے اور اگرچہ پورا شہر سائیں سائیں کر رہا تھا، اس کے باوجود صحابہ کرامؓ اپنی من مانی نہیں کر سکتے تھے۔ حدیبیہ میں یہ طے پایا تھا کہ مسلمان اس سال صرف عمرہ کریں گے جس میں کوہ عرفات اور وادی منیٰ میں قیام شامل نہیں تھا۔

مکہ سے عارضی طور پر جلاوطن ہونے والے قریش نے سابق غلام حضرت بلالؓ کو خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیتے ہوئے دیکھا۔ ان کی آواز میں دن میں تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' سے پوری وادی گونج اٹھتی

Marfat.com

جس کا مطلب ہے اللہ حرم میں موجود ان تمام بے بس بتوں سے بہت بڑا ہے جو مسلمانوں کو خدائے واحد کی پرستش سے نہیں روک سکتے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے یہ ایک شاندار فتح تھی جس سے بہت سے نوجوان قریش پہلے سے کہیں زیادہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ پرانا مذہب اب نابود ہو چکا ہے۔

مکہ میں قیام کی آخری شام حضورؐ کو ایک اور گھریلو خوشی اس وقت ملی جب آپؐ کے چچا عباس کو، جو ابھی تک پرانے مذہب پر قائم تھے، اپنے بھتیجےؐ سے ملاقات کرنے اور انہیں اپنی خواہر نسبتی حضرت میمونہؓ کے رشتے کی پیش کش کرنے کی اجازت دے دی گئی جو حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ (فاضل مصنفہ نے یہاں حضرت میمونہؓ بنت حارث کو غلطی سے حضورؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کی بہن لکھ دیا ہے حالانکہ وہ حضرت عباسؓ کی بیوی حضرت ام الفضلؓ کی بہن تھیں۔ مترجم)۔ آں حضرتؐ نے یہ رشتہ اس امید پر منظور کر لیا کہ آپؐ کے چچا اسلام قبول کر لیں گے۔ اس موقعے پر آپؐ نے قریش کو بھی شادی کی دعوت میں شرکت کرنے کے لیے کہا۔ قریش کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا چنانچہ سہیل نے پہاڑ سے نیچے اتر کر آپؐ کو بتایا کہ تین دن کی میعاد پوری ہو چکی ہے اس لیے آپؐ کو شہر سے فوراً چلے جانا چاہیے۔ اس وقت حضرت سعدؓ بن عبادہ، جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے، رسول کریمؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سہیل کی بظاہر گستاخانہ باتیں سن کر وہ طیش میں آ گئے لیکن آپؐ نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا: ''اے سعد! ان لوگوں سے، جو چل کر ہمارے پاس آئے ہیں، سخت کلامی نہ کرو۔'' (Lings: Muhammad, p.282)۔ اس کے بعد قریش یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ رات آنے سے پہلے صحابہ کرامؓ پورے نظم وضبط کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے اور انہوں نے نہ تو کوئی احتجاج کیا اور نہ ہی آبائی گھروں پر قبضہ کرنے کی کوئی کوشش کی۔ مسلمانوں نے پرامن واپسی کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ وہ جلد سے جلد واپس مدینہ جانا چاہتے ہیں۔

اس عجیب وغریب حج کا قصہ پورے عرب میں تیزی کے ساتھ پھیل گیا اور زیادہ سے زیادہ خانہ بدوش قبیلے حضورؐ کے اتحادی بننے کے لیے مدینہ آنے لگے۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ قریش کی نئی نسل نے جوق در جوق اسلام قبول کر لیا۔ آں حضرتؐ نے حدیبیہ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ آپؐ مکہ سے مدینہ آنے والے نومسلموں کو واپس بھیج دیں گے تاہم معاہدے کی اس شق میں ایک خامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ نے فنی بنیاد پر اس شرط کو غیر موثر بنا دیا۔ معاہدے میں نومسلم خواتین کو واپس مکہ بھیجنے کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی تھی چنانچہ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد آپؐ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کی سوتیلی بہن کو امت میں شامل کر کے انہیں مدینہ ہی میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن آپؐ نے ایک پرجوش نوجوان ابوبصیرؓ کو قریش کے ایک ایلچی کے ہمراہ واپس مکہ بھیج دیا البتہ ابوبصیرؓ نے سفر کے دوران اپنے نگہبان کو قتل کر دیا اور جب حضورؐ نے انہیں دوبارہ واپس

Marfat.com

بھیجا تو انہوں نے بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع قریش کے تجارتی راستے کے قریب پڑاؤ ڈال لیا جہاں مکہ کے کئی اور بیزار نوجوان ان کے ساتھ آ ملے۔ مستقبل میں اسلام قبول کرنے والے یہ لوگ راہزن بن گئے اور جو بھی تجارتی قافلہ ان کی زد میں آتا، وہ اس پر حملہ کر دیتے۔ اب قریش کو معلوم ہو گیا کہ اقتصادی ناکہ بندی کا عمل جزوی طور پر دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ آخر قریش نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ درخواست کی کہ وہ ان نوجوانوں کو مدینہ بلا کر ان سے معاہدے کی پاسداری کرنے کے لیے کہیں۔

اس طرح نومسلموں کے مدینہ آنے پر عاید پابندی کالعدم ہو گئی اور ۶۲۹ عیسوی میں نومسلموں کا ایک ریلا مدینہ پہنچ گیا۔ ان میں نوجوان جنگجو عمرو ابن العاص اور خالد بن ولید بھی شامل تھے جو حضورؐ کی کامیابی کی بنا پر آپؐ کے دعوئے نبوت کے قائل ہو گئے تھے۔ ''راستہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔'' خالد نے کہا: ''یہ شخص یقیناً پیغمبر ہے۔'' انہیں انتقامی کارروائی کا خدشہ تھا کیونکہ عمرو اور خود انہوں نے احد اور خندق کے معرکوں میں کئی مسلمانوں کو شہید کیا تھا تاہم رسول کریمؐ نے انہیں یقین دلایا کہ اسلام تمام سابق اعمال کو دھو دیتا ہے اور اب انہیں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔

سیاسی فتح کے اس سال کے دوران حضورؐ کو نجی زندگی میں ایک نئی خوشی ملی۔ آپؐ نے مدینہ میں جن خواتین سے شادی کی، ان میں سے کسی کے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب مصر کے شہر اسکندریہ کے گورنر نے گھنگریالے بالوں والی ایک خوبرو کنیز آپؐ کی خدمت میں بھیجی۔ مریم عیسائی تھیں اور اسلام قبول کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن وہ حضورؐ کی ثرایا بن گئیں۔ (ایک ایسی بیوی جو لونڈی کی حیثیت برقرار رکھے لیکن جس کے بچے مذہب کے معاملے میں آزاد ہوں)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زیادہ وقت حضرت مریمؓ کے ساتھ گزارنے لگے اور ۶۲۹ عیسوی میں جب وہ حاملہ ہوئیں تو آپؐ بے حد خوش ہوئے۔ ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کا نام آپؐ نے ابراہیمؑ رکھا۔ آپؐ ابراہیمؑ کو گود میں اٹھا کر مدینہ کا چکر لگاتے، سب راہ گیروں کو اس خوبصورت شیر خوار بچے کی تعریف کرنے کے لیے کہتے اور اسے اپنا ہم شکل قرار دیتے۔ لیکن اس خوشی کے ساتھ ساتھ آپؐ کو اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی وفات کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ وہ آپؐ کے عمرہ ادا کرنے کے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئیں۔ اسی سال کے آخر میں آپؐ نے شام کی سرحد کی جانب ایک فوجی مہم بھیجی جس میں آپ کے خاندان کے دو افراد شہید ہو گئے۔ اس المناک مہم کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں۔ ممکن ہے کہ آپؐ خیبر کے یہودی قبائل کی طرح وہاں کے عیسائی عربوں کے ساتھ اتحاد قائم کر کے انہیں امت میں شامل کرنا چاہتے ہوں۔ بہ ہر حال آپؐ نے حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کی قیادت میں ایک ہزار مسلمانوں کا دستہ شمال کی طرف روانہ کر دیا۔ بحیرہ مردار کے قریب موتہ گاؤں میں بازنطینیوں کی فوج نے

Marfat.com

مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے علاوہ دس دوسرے مسلمان شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے، جو اس مہم میں شامل تھے، اپنے فوجیوں کو مدینہ واپس لانے کا فیصلہ کر لیا۔

رسول اللہؐ نے یہ خبر سنی تو سیدھے جعفرؓ کے گھر چلے گئے۔ حضرت جعفرؓ کی بیوی حضرت اسماؓ بعد میں اس واقعے کو یاد کر کے بتایا کرتی تھیں کہ وہ روٹیاں پکا رہی تھیں کہ آں حضرتؐ ان کے گھر میں آئے۔ میں آپؐ کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ رسول کریمؐ نے حضرت جعفرؓ کے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا، جھک کر انہیں پیار کیا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپؐ سے یہ خبر سن کر حضرت اسماؓ عربوں کی روایت کے مطابق رونے اور چیخنے لگیں اور عورتیں ان کے پاس جمع ہو گئیں۔ جب حضورؐ اپنے اہل خانہ کی طرف چلے گئے تو آپؐ نے ان سے کہا کہ وہ حضرت جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنے میں غفلت نہ کریں۔ چنانچہ اگلے چند دنوں تک ان کے لیے آپؐ کے گھر سے کھانا آتا رہا۔ جب آپؐ واپس مسجد میں آنے کی غرض سے ایک گلی سے گزر رہے تھے تو حضرت زیدؓ کی ننھی بیٹی اپنے گھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور آپؐ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ رسول اللہؐ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور وہاں کھڑے ہو کر زار و قطار روتے رہے۔

موتہ میں شکست سے مدینہ میں آں حضرتؐ کی پوزیشن مزید خراب ہو گئی۔ حضرت خالدؓ جب فوج کو واپس لے آئے تو انہیں اہل مدینہ کے طنز و حقارت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ حضورؐ نے انہیں اپنی ذاتی حفاظت میں لے لیا۔ لیکن نومبر ۶۲۹ عیسوی میں عرب میں صورت حال ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گئی۔ قریش نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا، قریش کے ایک بدوی اتحادی قبیلے بنوبکر نے قریش کے بعض لوگوں کی ترغیب اور حمایت سے قبیلہ بنوخزاعہ پر ان کے علاقے میں شب خون مار دیا جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اتحاد میں شامل ہو گیا تھا۔ بنوخزاعہ نے فوری طور پر حضورؐ سے امداد کی درخواست کر دی چنانچہ قریش پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ انہوں نے رسول اللہؐ کو مکہ پر حملہ کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا ہے۔ صفوان اور عکرمہ جنگ لڑنے اور فتنہ انگیزی پر آمادہ تھے لیکن سہیل نے بنوبکر کے اس اقدام کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ابوسفیان اس سے بھی آگے بڑھ کر امن کوششوں کے سلسلے میں مدینہ پہنچ گیا۔

اس مرحلے پر ابوسفیان کا دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا البتہ اس نے کچھ عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ طوفان کا رخ آں حضرتؐ کے حق میں مڑ گیا ہے اور یہ کہ اب قریش کو جس قدر ممکن ہو، بہتر سمجھوتے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

وہ مدینہ میں اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کے گھر گیا اور حضورؐ کے بعض انتہائی قریبی ساتھیوں سے صلاح

Marfat.com

مشورہ کیا تا کہ وہ خود کو اس تنازعے سے الگ تھلگ رکھ سکے۔ پھر اس نے واپس مکہ آ کر اپنے قبیلے والوں کو ناگزیر صورت حال کو قبول کرنے کی غرض سے تیار کرنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان کی واپسی کے بعد حضورؐ نے ایک نئی مہم کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

۱۰ رمضان المبارک (جنوری ۶۳۰ عیسوی) کو آں حضرتؐ اب تک کی سب سے بڑی فوج کو لے کر مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ اس سپاہ میں امت کے تقریباً تمام لوگ شامل تھے۔ جب یہ فوج شاہراہ پر چل پڑی تو راستے میں اتحادی بدو قبائل بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس طرح فوج کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ حفاظتی نقطہ نظر سے مہم کی منزل مقصود کو خفیہ رکھا گیا تاہم فطری طور پر اس بارے میں بہت زیادہ تجسس پیدا ہو گیا اور قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ مکہ جانے کا امکان موجود تھا البتہ ان کی منزل بعض جنوبی قبائل بھی ہو سکتے تھے جن کا اسلام کے متعلق رویہ ابھی تک جارحانہ تھا۔ چنانچہ جنوبی قبیلے ہوازن نے طائف میں اپنی فوجیں جمع کر لیں۔ مکہ میں قریش کے لیڈر شدید اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے لہٰذا عباس، ابوسفیان اور بنوخزاعہ کا سردار ہدیل رات کی تاریکی میں مسلمانوں کی لشکر گاہ کی طرف چل پڑے۔ حضورؐ نے ابوسفیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا کہ آیا وہ اسلام قبول کرنے کو تیار ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ''میں کلمہ طیبہ کے پہلے حصے لا الہ الا اللہ (خدا کے سوا کوئی معبود نہیں) پر ایمان لانے کو تیار ہوں۔ مجھے یہ قطعی یقین ہو گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو مجھے ان حالات میں کوئی نفع تو پہنچاتا تاہم کلمہ طیبہ کے دوسرے حصے یعنی حضورؐ کی نبوت پر ایمان لانے کے سلسلے میں میرے دل میں اب بھی کھٹکا ہے۔'' ابوسفیان نے نماز فجر کے دوران مسلم سپاہ کو قبلہ رخ قطاروں میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ جب اس نے مختلف قبیلوں کو مکہ شہر کی طرف بڑھتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اب قریش کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ابوسفیان تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا مکہ گیا اور بلند آواز سے یہ اعلان کیا: ''اے گروہ قریش! یہ رہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہارے سروں پر آ گئے ہیں۔ تم ان کا سامنا نہیں کر سکتے اس لیے جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ امن پائے گا، وہ مامون ہو گا۔'' ابوسفیان کی بیوی ہند غصے سے اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے ابوسفیان کی مونچھیں پکڑ لیں اور چلاتے ہوئے لوگوں سے کہنے لگی: ''اس موٹے چربیلے شخص کو، جو مشک کی طرح پھولا ہوا ہے، مار ڈالو! قوم اس کے باعث تباہ ہو گئی۔ دیکھو تمہیں یہ چیزیں دھوکے میں نہ ڈالیں۔'' ابوسفیان نے قریش سے کہا کہ وہ ہند کی باتیں نہ سنیں کیونکہ اس قسم کی دھمکیوں کا وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کی فوج دیکھ لی تھی جس کا مقابلہ کرنے کی قریش میں سکت نہیں تھی۔ چنانچہ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر لیے جو رسول اللہؐ کی اطاعت قبول کرنے کی علامت تھی۔

Marfat.com

لیکن اہل مکہ میں سے چند لوگ جنگ کرنے پر آمادہ تھے۔ صفوان، عکرمہ اور سہیل نے ایک مختصر لشکر تیار کر لیا اور خالدؓ بن ولید کے دستے پر، جب وہ شہر میں داخل ہو رہا تھا، حملہ کرنے کی کوشش کی تاہم انہیں فوراً پسپا کر دیا گیا۔ صفوان اور عکرمہ یہ سوچ کر بھاگ گئے کہ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔ سہیل نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے گھر چلا گیا۔ باقی مسلم لشکر کسی جھڑپ کے بغیر مکہ میں داخل ہو گیا۔ خانہ کعبہ کے قریب رسول اللہؐ کے لیے ایک سرخ خیمہ نصب کر دیا گیا اور حضورؐ کی دو قریشی ازواج مطہرات حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ہمراہ وہاں پہنچ گئیں۔ آں حضرتؐ اور آپؐ کے اہل خانہ جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت علیؓ کی بہن حضرت ام ہانیؓ لڑائی میں حصہ لینے والے اپنے دو رشتے داروں کی جان بخشی کی درخواست لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئیں۔ اگرچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ ان دونوں افراد کو سزا دلانا چاہتے تھے لیکن رسول اللہؐ نے ام ہانیؓ سے فرمایا: ''جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی، جسے تم نے امن دیا، اسے ہم نے امن دیا۔ علی انہیں قتل نہ کریں۔'' آپؐ خونیں انتقام لینے کے ہرگز خواہاں نہیں تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے مکہ کے کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا اور نہ ہی ان لوگوں پر کوئی دباؤ ڈالا گیا۔ صلح اور امن اب بھی آپؐ کا مطمح نظر تھا۔

کچھ دیر تک سونے کے بعد آپؐ اٹھے اور فجر کی نماز ادا کی۔ پھر حضورؐ نے اپنی اونٹنی قصویٰ پر بیٹھ کر سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس دوران آپؐ بلند آواز سے ''اللہ اکبر'' کہتے جاتے۔ دس ہزار صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ نعرہ تکبیر لگانے لگے جس سے پورا شہر ''اللہ اکبر'' کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ اسلام کی آخری فتح کا یہ بھرپور مظاہرہ تھا۔ اس کے بعد آں حضرتؐ حرم میں ایستادہ بتوں کی طرف متوجہ ہوئے جو کعبۃ اللہ کی چھتوں اور بالکونیوں میں رکھے گئے تھے۔ آپؐ قریش کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے ایک ایک بت کو گراتے جا رہے تھے: ''حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔ بے شک باطل جانے اور زائل ہونے والا ہی تھا۔'' (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۱۔ مترجم)۔ مشرکوں نے کعبے کے اندر اپنے معبودوں کی جو مورتیاں سجا رکھی تھیں، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں مٹانے کا حکم دے دیا۔ ان میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہیں بھی شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے انہیں نہ چھیڑنے کا حکم دیا تھا۔

اس دوران بعض قریش گھروں سے نکل کر خانہ کعبہ کی طرف آ گئے اور حضورؐ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ رسول کریمؐ نے اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں خدا کے دین اور نئے نظام کو قبول کرنے کی دعوت دی اور ان سے کہا کہ وہ امت مسلمہ میں شامل ہو جائیں اور جاہلیت کے تفاخر اور مشرکانہ برائیوں کو ختم کر دیں جو بنی نوع انسان میں انتشار اور ناانصافی کا باعث ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے گروہ قریش! اللہ تعالیٰ نے تم

Marfat.com

سے جاہلیت کی نخوت اور آباء واجداد پر غرور کو زائل کر دیا، سب انسان آدمؑ سے پیدا ہوئے اور آدمؑ مٹی سے!''
(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۸۲۱: The Life of Muhammad, p.553)۔ آخر میں رسول خداؐ نے قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کی تلاوت کی جس میں خدا نے پوری انسانیت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ہے:

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا
اور ہم نے تمہارے گروہ اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو
بے شک تم میں سے سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے سب سے پرہیز گار ہے
یقیناً اللہ خبیر و علیم ہے (سورہ الحجرات آیت ۱۳)

ایک سچا کریم شخص کوئی جارحیت پسند جنگجو نہیں بلکہ رحم، بزرگوں کا احترام کرنے اور خدا خوفی کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔ قبیلے اور قوم کو پیدا کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ دوسروں پر بالادستی حاصل کی جائے۔ انسان کو دوسروں پر غلبہ پانے، ان کا استحصال کرنے، ان کا جبراً مذہب تبدیل کرنے، فتح یا انہیں تباہ کرنے کی نہیں، دوسرے قبیلوں اور قوموں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک گروہ میں رہ کر پرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر کاربند رہنے کا نصب العین یہ ہے کہ انہیں غیر ملکیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا جائے، اس کا حقیقی منشا نسل انسانی کا اتحاد ہے۔ حضورؐ نے عرب میں اشراف اور اعلیٰ خاندان کے تصور کو از سر نو تشکیل دے کر اسے آفاقی نظریہ بنا دیا اور رحم دلی اور خدا ترسی کے جذبات کو اعلیٰ اقدار کا درجہ دے دیا۔

لیکن کیا قریش اس کے لیے تیار تھے؟ پیغمبر اسلامؐ نے فتح مکہ کے دن عام معافی کا اعلان کر دیا۔ صرف دس افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان میں عکرمہ (لیکن بوجوہ صفوان نہیں) اور وہ اشخاص شامل تھے جو اسلام دشمن پروپیگنڈا کرتے رہے تھے یا جنہوں نے رسول اللہؐ کے اہل خاندان کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ لیکن جن لوگوں نے آں حضرتؐ سے معافی کی درخواست کی، انہیں معاف کر دیا گیا۔ خانہ کعبہ میں خطاب کے بعد آپؐ کوہ صفا پر چلے گئے جہاں آپؐ نے مکہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ آپؐ کی اطاعت گزاری کا عہد کریں اور آپؐ کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیں۔ پھر قریش میں سے ہر شخص فرداً فرداً اس حال میں آپؐ کے پاس آتا گیا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ایک عورت نقاب اوڑھے رسول خداؐ کے سامنے آئی اور جب وہ بولی تو حضورؐ نے اسے پہچان لیا۔ یہ ابوسفیان کی بیوی ہند تھی جس نے معرکہ احد میں حضرت حمزہؓ کی لاش کو مسخ کر کے ان کا کلیجہ چبانے کی کوشش کی تھی۔ ''تم ہند بنت عتبہ ہو؟'' آپؐ نے پوچھا۔ ''ہاں!'' اس نے گستاخی سے جواب دیا۔ ''جو کچھ میں نے کیا، اس پر مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے ندامت کا اظہار کیے بغیر کہا: ''اور خدا آپؐ کو معاف کرے گا!'' رسول کریمؐ نے ہند سے یہ عہد لیا کہ وہ بدکاری یا چوری کا ارتکاب

Marfat.com

نہیں کرے گی اور اپنے بچوں کو قتل نہیں کرے گی۔ اس پر ہند نے جواب دیا: ''میں نے اپنے بچوں کو پالا پوسا اور جب وہ جوان ہوئے تو آپؐ نے بدر میں انہیں قتل کر دیا اس لیے آپؐ ان کے بارے میں بہتر جانتے ہیں۔'' آں حضرتؐ نے خاموشی اختیار کر کے ہند کے اس نکتے کو درست تسلیم کر لیا۔ (ابو جعفر الطبری: تاریخ رسول والملوک صفحہ ۶۴۲: The Life of Muhammad, p.553)۔ ہند نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہنے لگی: اے اللہ کے رسولؐ! اب میں مسلمان ہوں اس لیے آپؐ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔'' اس پر حضورؐ مسکرا پڑے اور آپؐ نے فرمایا: ''بلاشبہ تم آزاد ہو۔'' ہند نے بعد میں دیکھا کہ ابوسفیان کے تعاون کے صلے میں اس کے شوہر اور بیٹوں کو امت میں اہم عہدے دیے گئے۔

صفوان اور عکرمہ کے رشتے داروں نے ان کی جان بخشی کے لیے رسول کریمؐ سے درخواست کی اور آپؐ نے انہیں اس شرط پر امان دینے کا وعدہ کر لیا کہ وہ دونوں آپؐ کی قیادت کو تسلیم کر لیں تو مکہ میں آزادانہ داخل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا اور عکرمہ نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ حضورؐ نے نہایت شفقت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے باپ ابوجہل کے بارے میں بدگوئی کرنے کی ممانعت کر دی۔ صفوان اور سہیل دونوں نے آپؐ کی اطاعت قبول کر لی لیکن مسلمان نہ ہوئے تاہم چند روز بعد ہی انہوں نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

فتح مکہ کے بعد آپؐ کو ہوازن اور ثقیف قبیلوں کے ساتھ نمٹنا پڑا جنہوں نے طائف کے قریب بیس ہزار کی نفری پر مشتمل فوج اکٹھی کر لی تھی۔ حضورؐ نے جنوری ۶۳۰ عیسوی کے آخر میں حنین کی جنگ میں انہیں شکست دے دی جس کے بعد ہوازن کا قبیلہ امت کے اتحاد میں شامل ہو گیا۔ مسلمان طائف شہر پر قبضہ نہ کر سکے لیکن اپنے اہم بدو اتحادی قبیلے کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد ایک سال میں اس شہر کو مجبوراً اطاعت قبول کرنا پڑی۔ حنین کی فتح کے بعد رسول کریمؐ نے جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ابوسفیان، سہیل اور صفوان کو زیادہ حصہ دے دیا۔ اس سے صفوان اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے پیغمبرؐ ہیں۔'' (Lings: Muhammad, p.311)۔ ان کے بعد سہیل بھی مسلمان ہو گئے۔

اس بظاہر اقربا پروری کے نتیجے میں بعض انصار کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے قبیلے کے ساتھ دوبارہ مل جانے کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہیں چھوڑ دیں گے؟ حضورؐ نے فوری طور پر نہایت رقت انگیز تقریر کر کے انصار کو دوبارہ یقین دہانی کرائی جس کے بعد بہت سے انصار کی داڑھیاں

Marfat.com

آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے گروہ انصار! تم دنیا کی حقیر شے کے لیے غمگین اور رنجیدہ ہو گئے۔ اس سے میں نے کچھ لوگوں کی دلداری کرنا چاہی تا کہ وہ اسلام لے آئیں جب کہ میں نے تمہیں اسلام کے سپرد کر دیا۔ اے گروہ انصار! کیا تم اس بات سے خوش نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم اپنے کجاووں میں اللہ کے رسولؐ کو لوٹا کر لے جاؤ۔ پھر قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا اور اگر لوگ ایک گھاٹی میں اور انصار دوسری گھاٹی میں چلتے تو میں انصار کی گھاٹی میں چلتا۔ اے خدا! انصار پر، ان کی اولاد پر اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۸۸۶: The Life of Muhammad, p.596)۔

یہ ایک عجیب فتح تھی اور ایک غیر جانبدار مبصر اس بات پر حیرت کا اظہار کر سکتا ہے کہ مسلمان اور قریش آخر کیوں لڑ پڑے تھے؟ (Bamyeh: Social Origins of Islam, pp.227-29)۔ حضورؐ اپنے دعوے پر قائم رہے اور آپؐ مہاجرین اور انصار کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔ آپؐ نے مکہ پر خود حکومت کرنے کی کوشش نہ کی، نہ ہی قریش کے حکام کی جگہ اپنے صحابہؓ کو تعینات کیا اور نہ ہی وہاں پر خالص اسلامی حکومت قائم کی۔ حرم میں تمام سابق اہم اشخاص کے عہدے برقرار رکھے گئے۔ آپؐ سے شدید نفرت کرنے والے دشمنوں کو نہ صرف بحال کر دیا گیا بلکہ انہیں ترقی دے کر ان پر تحائف کی بارش کر دی گئی۔ حضورؐ حرم میں حاجیوں کو پانی پلانے کے سب سے اہم اور معززانہ کام کو کسی دوسرے قبیلے کے سپرد کرنے والے تھے کہ اتنی دیر میں کعبۃ اللہ کا کلید بردار آپؐ کو چابیاں پیش کرنے وہاں پہنچ گیا۔ رسول کریمؐ نے اس سے کہا: ''تم دیکھ رہے ہو کہ یہ چابی اب میرے ہاتھ میں ہے اور میں جسے چاہوں یہ چابی دے سکتا ہوں۔'' اس شخص نے خیال کیا کہ آپؐ یہ منصب اپنے کسی صحابیؓ کے سپرد کر دیں گے۔ چنانچہ وہ پریشانی کی حالت میں کہنے لگا: ''تو اب قریش کی سطوت وقوت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے!'' اس پر آں حضرتؐ نے اسے چابی لوٹاتے ہوئے کہا: ''یہ نہیں بلکہ آج قریش کی قوت اور شان وشوکت میں اضافہ ہو گیا ہے!''

(واقدی: صفحات ۸۳۷، ۸۳۸: Bamyeh: Social Origins of Islam, p.228)۔

رسول کریمؐ کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مدینہ واپسی کے بعد بھی ابن ابی کے کیمپ میں حضورؐ کی مخالفت جاری رہی اور آپؐ کو قتل کرنے کی ایک اور سازش بھی کی گئی۔ اکتوبر ۶۳۱ عیسوی میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ مدینہ میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ چنانچہ آپؐ کو مجبوراً یہ مسجد ڈھانا پڑی۔ اگلی صبح آپؐ نے اپنے خلاف سازشیں کرنے والوں کے طرز عمل کے بارے میں تحقیقات کیں تو ان لوگوں نے فوری طور پر آپؐ سے معذرت کر لی۔ کئی لوگوں نے معقول عذر پیش کیے۔ آخر

Marfat.com

تین افراد سے دو ماہ کے لیے قطع تعلق کرنے کا حکم دے دیا گیا۔اس اقدام کے نتیجے میں مسلمانوں کی مخالفت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ابن ابی وفات پا گیا اور رسول کریمؐ احترام کے طور پر اپنے پرانے حریف کی قبر کے پاس کھڑے رہے۔ آپؐ مدینہ میں دیرپا متحد معاشرہ قائم کرنے میں بالآخر کامیاب ہو گئے۔ اب زیادہ سے زیادہ بدوی قبائل نے مذہبی وژن سے قطع نظر آپؐ کی سیاسی بالادستی کو تسلیم کر لیا۔ ہجرت کے بعد دس سال کی مختصر مدت میں رسول اللہؐ نے عرب کے اس سیاسی اور روحانی منظر کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا جس کا سابق حالت کی طرف لوٹنا ناممکن تھا۔

اب رسول کریمؐ کی صحت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور ۶۳۲ عیسوی کے شروع تک آپؐ کو پوری طرح یہ احساس ہو گیا کہ آپؐ کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ جب آپؐ کے کمسن صاحبزادے ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تو آپؐ پھوٹ پھوٹ کر روئے البتہ آپؐ کو یقین تھا کہ آپؐ ابراہیمؓ کے ساتھ جنت میں جلد ہی اکٹھے ہوں گے۔ لیکن جب حج کا روایتی مہینہ قریب آیا تو آپؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ اس سال آپؐ عازمین کی قیادت خود کریں گے۔ چنانچہ فروری کے آخر میں آپؐ تمام امہات المومنینؓ اور حاجیوں کے ایک بہت بڑے قافلے کو لے کر مدینہ سے چل پڑے اور مارچ کے شروع میں مکہ کے باہر پہنچ گئے۔ حضورؐ نے حج کے مناسک ادا کیے جو عربوں کو دل سے عزیز تھے اور جن کو آپؐ نے ایک نئی اہمیت دے دی تھی۔ مسلمان قبائلی معبودوں کی پرستش کرنے کے بجائے اس خانہ کعبہ کے گرد جمع ہو گئے جو ان کے جد امجد اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ حاجی جب صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے سعی کر رہے تھے تو آں حضرتؐ نے عازمین کو ہدایت کی کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کی یاد تازہ کریں جب وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے بیابان میں چھوڑنے کے بعد بچے کے لیے پانی تلاش کرنے کی غرض سے صفا اور مروہ کے درمیان بے قراری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ اس وقت خدا نے زمین کی گہرائیوں سے زم زم کا چشمہ نکال کر ان کی جانیں بچائی تھیں۔ اس کے بعد حجاج میدان عرفات میں جمع ہوئے جہاں پہلے پیغمبر اور نسل انسانی کے باپ حضرت آدمؑ اور اللہ نے عہد و پیمان باندھا تھا۔ انہوں نے منیٰ میں تین ستونوں پر کنکریاں مار کر خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے عہد کی تجدید کی اور آخر میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے خدا کی رضا کے لیے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کی یاد میں بھیڑ یا جانور کی قربانی دی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوہ عرفات کے قریب جس مقام پر کھڑے ہو کر مسلمانوں سے الوداعی خطاب کیا، آج اس جگہ مسجد نمرہ کھڑی ہے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ انصاف برتاؤ کرنے، عورتوں سے حسن سلوک اور دور جاہلیت کی خونین عداوتوں کو ختم کرنے کی ہدایت کی اور کہا

Marfat.com

مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔ ''امت ایک ہے، خوب سمجھ لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں لہٰذا کسی بھی آدمی کے لیے اپنے بھائی کی کوئی چیز حلال نہیں بجز اس کے کہ وہ بطیب خاطر کوئی چیز خود دے دے۔ رسول کریمؐ نے اپنے آخری خطاب کے آخر میں فرمایا: ''خدایا! کیا میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟'' ان الفاظ میں دلسوزی اور دلگدازی تھی۔ حضورؐ جانتے تھے کہ آپؐ کی مسلسل نصیحتوں کے باوجود تمام مسلمان آپؐ کے مذہبی وژن کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کے اجتماع سے غالباً آخری مرتبہ خطاب کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپؐ اس بات سے متعجب ہوئے ہوں کہ آیا آپؐ کی تمام کوششیں رائیگاں گئی ہیں؟ ''اے لوگو!'' آپؐ نے اچانک بلند آواز میں فرمایا: ''بتاؤ کیا میں نے آپ کو خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟'' اس پر پورے مجمعے نے اثبات میں جواب دیا: ''اللّٰھم نعم!'' (اے خدایا! ہاں)۔ آں حضرتؐ نے نہایت رقت انگیز لہجے میں لوگوں سے کئی بار یہی سوال پوچھا اور حجاج نے ہر بار اللّٰھم نعم کے الفاظ دہرائے یہاں تک کہ اس آواز سے پوری وادی گونج اٹھی۔ حضورؐ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا: ''خدایا گواہ رہنا!''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۹۶۹: The Life of Muhammad, p.651)۔

مدینہ واپس آنے کے بعد رسول اللہؐ کو وقفے وقفے کے ساتھ شدید سر درد ہونے لگا اور بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ لیکن آپؐ مستقل طور پر بستر پر نہ لیٹے۔ آپؐ سر پر کپڑا لپیٹ کر نماز کی امامت کراتے یا مسلمانوں سے خطاب کرنے مسجد میں چلے جاتے۔ ایک صبح حضورؐ نے شہدائے احد کے لیے خاص طور پر طویل دعا مانگی اور فرمایا: ''اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اس دنیا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، کے درمیان اختیار دیا کہ چاہو تو دنیا لے لو اور چاہو تو ماعنداللہ قبول کرو اور اس بندے نے ماعنداللہ اختیار کر لیا ہے۔'' صحابہ کرامؓ میں وہ واحد شخص جو آں حضرتؐ کی وفات کا عندیہ سمجھ گئے، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے چنانچہ وہ زار و قطار رونے لگے۔ ''ابوبکر! سہولت سے کام لو۔'' رسول اللہؐ نے ابوبکرؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۰۶)۔

آخر میں حضرت میمونہؓ کے حجرے میں آپؐ پر مرض نے شدت اختیار کر لی۔ پھر آپؐ کی تمام ازواج مطہراتؓ آپؐ کے گرد جمع ہو گئیں اور آپؐ مسلسل یہ پوچھتے جا رہے تھے: ''کل میں کہاں ہوں گا؟ کل میں کہاں ہوں گا؟'' ازواج مطہراتؓ نے یہ محسوس کر لیا کہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس جانے کے خواہش مند ہیں چنانچہ سب نے متفقہ طور پر حضورؐ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں منتقل کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموشی کے ساتھ وہاں لیٹے رہے اور آپؐ کا سر حضرت عائشہؓ کی گود میں تھا۔ لیکن لوگوں نے سمجھا کہ یہ ایک

Marfat.com

عارضی علالت ہے۔ گو کہ حضرت ابوبکرؓ نے بار بار لوگوں کو خبردار کیا کہ آں حضرتؐ اب اس دنیا میں نہیں رہیں گے، اس کے باوجود امت مسلمہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ جب آپؐ زیادہ بیمار ہو گئے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ وہ امامت کر کے نماز پڑھا دیں۔ اس دوران آپ بعض اوقات نماز پڑھنے مسجد میں چلے جاتے اور نقاہت کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا کر لیتے۔

۱۲ ربیع الاول ۸ جون ۶۳۲ عیسوی کو حضرت ابوبکرؓ نے نماز کے دوران محسوس کیا کہ لوگوں کی توجہ ان سے ہٹ گئی ہے چنانچہ انہوں نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ حضورؐ مسجد میں تشریف لے آئے ہیں۔ آپؐ کی طبیعت اس قدر بہتر معلوم ہونے لگی کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کا چہرہ مبارک معمول سے زیادہ روشن و تاباں تھا۔ آپؐ کو دیکھ کر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت ابوبکرؓ فوری طور پر پیچھے ہٹ گئے لیکن رسول اللہؐ نے ابوبکرؓ کی پشت پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''نماز پڑھاتے رہو۔'' چنانچہ حضورؐ نے ان کے دائیں طرف بیٹھ کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں واپس چلے گئے اور ان کی گود میں سر رکھ کر خاموشی سے لیٹ گئے۔ آپؐ کی طبیعت اس قدر بہتر معلوم ہونے لگی کہ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کی دوسری جانب رہنے والی بیوی کے پاس جانے کی اجازت مانگ لی۔ سہ پہر کو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے ملاقات کے بعد مسلمانوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ آپؐ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ جب شام ہونے لگی تو حضرت عائشہؓ نے محسوس کیا کہ رسول اللہؐ ان کی گود میں بھاری ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود حضرت عائشہؓ نے یہ محسوس نہ کیا کہ کیا ہو رہا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو یہ کہتے سنا: ''اے خداوند! اے جنت میں میرے بہترین ساتھی!'' جبرئیلؑ آپؐ کو لے جانے کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۰۶)۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کی طرف دیکھا تو آپؐ کی روح قبض ہو چکی تھی۔ انہوں نے احتیاط کے ساتھ آپؐ کا سر تکیے پر رکھ دیا اور کھڑے ہو کر عورتوں کے ساتھ سینہ کوٹنا اور روایتی طریقے سے ہاتھ چہرے پر مارنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے عورتوں کی گریہ وزاری کو سنا تو وہ شدت غم سے نڈھال ہو کر زرد چہروں کے ساتھ تیزی سے مسجد میں جمع ہو گئے۔ حضورؐ کے انتقال کی خبر پورے نخلستان میں فوراً پھیل گئی اور حضرت ابوبکرؓ جلدی سے واپس شہر آ گئے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور آپؐ کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد وہ مسجد میں گئے جہاں عمرؓ مسلمانوں سے خطاب کر رہے تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ آں حضرتؐ کا انتقال ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے: ''رسول اللہؐ کی روح عارضی طور پر آپؐ سے جدا ہوئی ہے۔ آپؐ یقیناً اپنی قوم میں واپس آئیں گے اور سب سے آخر میں انتقال کریں گے۔'' حضرت عمرؓ کے

Marfat.com

چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار دیکھ کر ابوبکرؓ نے کہا: ''عمر! سہولت سے کام لو، خاموش ہو جاؤ۔'' لیکن عمرؓ نہ مانے اور تقریر کرتے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ دیکھا کہ عمرؓ خاموش ہی نہیں ہوتے تو وہ آہستہ سے آگے بڑھے۔ لوگ ابوبکرؓ کے چہرے کے تاثرات اور ان کے پرسکون انداز سے متاثر ہوئے اور عمرؓ کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ حضورؐ کی پوری زندگی توحید کا پرچار کرنے کے لیے وقف تھی۔ مسلمان یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ آں حضرتؐ فانی انسان نہیں؟ آپؐ کی وفات سے انکار کرنا آپؐ کے پیغام کی صداقت سے انکار کے مترادف ہے۔ لیکن جب تک مسلمان اس عقیدے پر قائم رہیں گے کہ عبادت اور پرستش کے لائق صرف خدا کی ذات ہے، اس وقت تک رسول اللہؐ بھی زندہ رہیں گے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زندگی بھر مسلمانوں سے یہ کہتے رہے کہ وہ آپؐ کی اس طرح عزت و تکریم نہ کریں جس طرح عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی توقیر کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ بھی ایک فانی انسان تھے۔ ''اے لوگو! جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوجا کرتے تھے تو سن لو کہ محمدؐ تو مر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ بے شک زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں ہے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۱۲: The Life of Muhammad, p.683)۔ حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کے آخر میں اس قرآنی آیت کی تلاوت کی جو غزوہ احد میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب بہت سے مسلمان آپؐ کے قتل کی افواہ سن کر پریشان ہو گئے تھے:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف اللہ کے رسولؐ ہی ہیں
ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں
کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید کر دیے جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟
اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑے گا
عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا (سورہ آل عمران آیت ۱۴۴)

قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کا مسلمانوں پر اس قدر اثر ہوا جیسے انہوں نے یہ آیت پہلی مرتبہ سنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بدحواس ہو کر کہا: ''یہ وہ آیت ہے کہ میں نے ابوبکر ہی کو تلاوت کرتے سنا۔ پھر مجھ پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے اور اب میں سمجھ گیا کہ واقعی رسول اللہؐ وفات پا گئے ہیں۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۱۳: The Life of Muhammad, p683)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات اور وفات دونوں متنازع رہی ہیں۔ آپؐ کے پیغمبرانہ

Marfat.com

کیریئر کی مکمل اہمیت کو آپؐ کے بہت کم پیروکار سمجھ سکے۔ ملت اسلامیہ کے درمیان اختلافات حدیبیہ میں اس وقت کھل کر سامنے آ گئے تھے جب بیشتر صحابہ کرامؓ کسی معجزے کی توقع کر رہے تھے۔ مختلف لوگوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے صحابہؓ سماجی انصاف کے نصب العین پر یقین رکھتے تھے لیکن انہیں حضورؐ کے عدم تشدد اور صلح کے پیغام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ راہزن نوجوان، جنہوں نے ابوبصیرؓ کی پیروی کی، ان کا ایجنڈا پیغمبر اسلامؐ سے بالکل مختلف تھا۔ جن خانہ بدوش قبائلیوں نے ۶۲۸ عیسوی میں حج کے موقعے پر آپؐ کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا، اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی مذہبی نہیں، سیاسی وجوہ کی بنا پر قائم تھی۔ دراصل اسلام میں شروع ہی سے یک رنگی اور کامل مفاہمت کا فقدان تھا۔

مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کی کمی پر حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو عموماً کند ذہن اور ان کے مشن کے عمیق پہلو سے لاعلم اور عاقبت نااندیش ظاہر کیا گیا ہے۔ مثالی شخصیتیں عام طور پر اپنے عہد سے بہت آگے سوچتی ہیں، ان کے ہم عصر ان کی شخصیت کو ٹھیک طرح سمجھ نہیں پاتے اور ان کی وفات کے بعد ان کی تحریک کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ گوتم بدھ کی وفات کے تھوڑی دیر بعد بدھ مت میں دو مکاتب فکر پیدا ہو گئے تھے۔ اسی طرح اسلام میں بھی وہ اختلافات، جنہوں نے آپؐ کی حیات مقدسہ کے دوران امت مسلمہ کو منقسم کر دیا تھا، آپؐ کی وفات کے بعد زیادہ واضح ہو گئے۔ بہت سے خانہ بدوش قبائل قرآن حکیم کے مذہبی پیغام کی روح کو مکمل طور پر نہ سمجھ سکے۔ انہیں یقین تھا کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے ساتھ ہی اسلام بھی ختم ہو گیا ہے چنانچہ جس طرح وہ کسی مرحوم سردار سے کیے جانے والے معاہدے سے منحرف ہو جایا کرتے تھے، اسی طرح انہوں نے ملت اسلامیہ سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ آں حضرتؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے خلفا یا جانشینوں نے امت کی قیادت کی۔ پہلے چاروں خلفا حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ کا انتخاب مسلمانوں نے کیا اور انہیں خلفائے راشدینؓ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے عرب کے باہر عسکری مہموں کے دوران جنگوں کی قیادت کی لیکن اس وقت ان لڑائیوں کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں تھی۔ کسی بھی سیاست دان یا فوجی جرنیل کی طرح خلفائے راشدینؓ نے بھی قرآنی احکام پر عمل کرنے کے مقابلے میں ان سیاسی مواقع سے زیادہ فائدہ اٹھایا جو فارس اور بازنطینی سلطنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور رسول اللہؐ کے نواسے حضرت حسینؓ کی شہادت کو بعد میں سیاسی اہمیت مل گئی لیکن اصل میں ان واقعات کا تعلق جاہلی اور ابتدائی دور کی سیاست کو ایک بڑی عالمی طاقت میں تبدیل کرنے کے تشکیلی دور سے ہے۔

اس سیاسی انتشار کی بہ نسبت زیادہ حیرت انگیز بات مسلمانوں کا ردعمل ہے۔ ان میں قرآن کی تفہیم کا

Marfat.com

عمل ان ہولناک واقعات کے بعد مزید تیز ہو گیا۔ اسلام میں تقریباً تمام بڑے بڑے مذہبی اور ادبی شعبوں میں اہم پیش رفت کے پیچھے رسول اللہؐ کے حقیقی وژن کی جانب مراجعت کی خواہش کارفرما تھی۔ بہت سے لوگ بعد میں آنے والے خلفا کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے دہشت زدہ ہو گئے اور انہوں نے ابتدائی امت کے سادہ طرز زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کی۔ صوفیائے عظام، مذہبی رہنماؤں، مورخوں اور قانون دانوں نے اس ضمن میں کئی اہم سوال اٹھائے۔ وہ معاشرہ جو اپنے مخلص اور پارسا لیڈروں کو قتل کر دے، یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ خدا اس کی رہنمائی کر رہا ہے؟ امت کی قیادت کس قسم کے لوگوں کو کرنی چاہیے؟ وہ حکمران، جن کی رعایا کی اکثریت غریب ہے اور وہ خود عیش کوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں، سچے مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں؟

ملت اسلامیہ کی سیاسی قیادت کے سوال پر بحث مباحثے عیسائیت میں چوتھی اور پانچویں صدی کے دوران ہونے والے منطقی مباحث کے ساتھ گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ اسلامی تصوف کی جڑیں اسی اضطراب اور بے چینی میں پیوست ہیں۔ صوفیائے کرام نے حکمرانوں کی عیش و عشرت سے منہ موڑ کر رسول اللہؐ کی پیروی کرتے ہوئے سادہ زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ انہوں نے حضورؐ کے اسرا اور معراج کا مثالی نمونہ سامنے رکھ کر تصوف کا نظام متعارف کرایا۔ حضرت علیؓ کے پیروکار شیعہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ امت کی قیادت صرف حضرت علیؓ کے جانشینوں کو کرنی چاہیے۔ انہوں نے اکثریتی مسلمانوں کے معاشرے میں ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج کیا اور قرآن کی انصاف اور مساوات کی اصل روح کی جانب مراجعت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ عالم اسلام میں اٹھنے والی تمام تحریکوں کا مطمح نظر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بلند قامت شخصیت سے رہنمائی حاصل کرنا اور قرآنی وژن کی نئی جہتیں دریافت کر کے یہ ظاہر کرنا ہے کہ وحی الٰہی میں نئے حالات کا مقابلہ کرنے کی وہ بھرپور صلاحیت موجود ہے جو کسی بھی عظیم عالمی تحریک کے لیے لازم ہے۔ مسلمان رسول خداؐ کی شخصیت کو شروع ہی سے ایک ایسا پیمانہ سمجھتے ہیں جس سے وہ اپنے سیاست دانوں کے طرز عمل کو چیلنج کرتے اور ملت اسلامیہ کی سیاسی صحت کو ناپتے ہیں۔

آج بھی اسی ارفع جذبے کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان مفکر مکہ کے خلاف جہاد کو حضورؐ کے کیریئر کا نقطہ عروج سمجھتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ آپؐ نے آخر کار جنگ سے دست بردار ہو کر عدم تشدد کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ مغربی نقاد بھی پیغمبر اسلامؐ کو جنگجو شخص ظاہر کرنے پر اڑے ہوئے ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضورؐ روز اول ہی سے اس جاہلی ہٹ دھرمی اور خود بینی و خود نمائی کے سخت مخالف تھے جس نے نہ صرف اس دور کی جارحیت کی آگ کو بھڑکایا بلکہ آج بھی مغربی لیڈروں اور مسلم رہنماؤں میں اس کی یکساں جھلک نظر آ رہی ہے۔ نبی کریمؐ کی شخصیت کو، جن کا نصب العین امن اور عملی لطف و کرم تھا، افتراق اور

Marfat.com

جنگ وجدال کی علامت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ نہ صرف ایک افسوسناک بلکہ اس استحکام کے لیے بے حد خطرناک صورت حال ہے جس پر ہماری آئندہ نسلوں کا انحصار ہے۔

میں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سوانح حیات پر مبنی اپنی پہلی کتاب: Muhammad A Biography of the Prophet کے آخر میں کینیڈا کے اسکالر ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ کے دوراندیشی پر مبنی الفاظ نقل کیے تھے۔ انہوں نے سویز بحران سے تھوڑی دیر پہلے بیسویں صدی کے وسط میں لکھا تھا کہ ایک صحت مند اور فعال اسلام ان اعلیٰ اقدار کو فروغ دینے کے سلسلے میں صدیوں سے مسلمانوں کی معاونت کرتا رہا ہے جن پر مغرب کے باشندے بھی کاربند ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اقدار نے مسلمانوں اور مغرب کی مشترک روایات کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ بعض مسلمان مغرب کی جدت پسندی کو قبول کرنے میں متذبذب ہیں، وہ اہل کتاب کے کلچر کے خلاف ہو گئے ہیں اور انہوں نے عیسائیت اور یہودیت کے خلاف نئی نفرت کو اسلامی رنگ دینا شروع کر دیا ہے حالانکہ قرآن نے پوری قوت کے ساتھ ان مذاہب کی توثیق کی ہے۔ کینٹ ویل اسمتھ نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ اگر مسلمانوں کو عہد حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے تو انہیں ہماری مغربی روایات اور اداروں سے سبق سیکھنا چاہیے کیونکہ یہ روایات اور ادارے ختم نہیں ہوں گے۔ اگر مسلم معاشرے نے یہ نہ کیا تو وہ بیسویں صدی کے امتحان میں پورا نہیں اتریں گے۔ لیکن مغرب کے لوگوں کو بھی یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ اس کرہ ارض پر آباد مسلمانوں کو اپنا ہم پلہ نہیں، خود سے کم تر مخلوق سمجھتے ہیں۔

مغربی تہذیب جب تک ذہنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اور مسیحی کلیسا مذہبی لحاظ سے دوسرے انسانوں کے ساتھ احترام سے پیش نہیں آتا، انہیں بیسویں صدی کے حقائق کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ ان مسئلوں کی جڑیں بہت گہری ہیں لہٰذا ہمیں اسلام کے بارے میں اپنا رویہ تبدیل کرنا ہوگا۔

-(Wilfred Cantwell Smith: Islam in Modern History, p.305)

اکیسویں صدی کی مختصر تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی بھی فریق نے ان حقائق سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اگر ہمیں تباہی سے بچنا ہے تو اس کے لیے عالم اسلام اور مغربی دنیا کو نہ صرف برداشت کرنے بلکہ ایک دوسرے کی قدر کرنا ہوگی۔ اس عمل کا آغاز ہمیں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس سے کرنا چاہیے جو ایک پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے، جنہوں نے سہل پسندی کی مزاحمت کی اور بعض اوقات ایسے کام کیے جنہیں تسلیم کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ لیکن حضورؐ کی شخصیت میں بلند پائے کی خوبیاں موجود تھیں اور آپؐ نے دنیا میں ایک ایسے دین اور ثقافت کی اعلیٰ روایات قائم کیں جن کی بنیاد تلوار پر نہیں رکھی گئی بلکہ اس کا نام ''اسلام'' ہے جس کا مطلب ہے امن اور صلح!

Marfat.com

اشاریہ

ابراہیم علیہ السلام ۱۲، ۲۹، ۳۰، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۹۷، ۹۸

ابراہیمؓ، سیّدنا ۱۵۵، ۱۶۲

ابرہہ ۱۹

ابن دغنہ ۷۰

ابوالحکم، ابوجہل ۵۷، ۵۸، ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۶۶، ۶۷، ۸۸، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۴، ۱۶۰

ابوالعاص ۳۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۳۲

ابوبراءؓ ۱۱۹

ابوبصیرؓ ۱۵۴، ۱۶۶

ابوجریر الطبری ۶، ۴۷، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۲، ۵۳، ۷۳، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۶۰

ابوجندلؓ ۱۴۹

ابوسفیانؓ ۵۷، ۵۸، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۴۴، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰

ابوسلمہ ۱۲۲

ابوطالب ۲۲، ۳۶، ۴۷، ۵۵، ۵۶، ۶۸، ۶۹، ۱۵۳

ابولہب ۴۷، ۵۶، ۶۳، ۶۸، ۶۹، ۸۸، ۱۰۵، ۱۱۴

ابوبکر صدیقؓ ۳۷، ۳۸، ۶۲، ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۸۰، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۷، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶

ادریس علیہ السلام ۷۳

اسحاق علیہ السلام ۷۶، ۷۷

اسماعیل علیہ السلام ۲۹، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۹۷، ۱۶۲

اسماءؓ (زوجہ جعفرؓ) ۱۵۵

اسید ۸۲

امامہؓ، سیّدہ ۱۱۱، ۱۲۳

اُم الفضل (زوجہ عباسؓ) ۱۵۴

اُمیہ بن خلف ۵۷، ۶۲، ۶۳، ۷۰، ۱۰۱، ۱۰۵

اُم بکر ۳۷

اُم حبیبہؓ (رملہ) ۱۵۳، ۱۵۶

اُم سلمہ (ہند بنتِ ابی امیہ) ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۴۱، ۱۴۹، ۱۵۸

اُم کلثومؓ، سیّدہ ۲۴، ۵۶، ۱۱۰

اُم ہانیؓ (ہمشیرہ سیّدنا علیؓ) ۱۵۸

انس بن مالکؓ ۱۳۶، ۱۳۷

آدم علیہ السلام ۲۹، ۷۳، ۱۵۸، ۱۶۲

آمنہ ۲۲

آیت اللہ خمینی ۹

برا ابن معرورؓ ۸۶

Marfat.com

بلال حبشیؓ ۳۷، ۶۲، ۶۳، ۷۰، ۹۱، ۱۵۳

جعفرؓ ابن ابی طالب ۳۷، ۴۷، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶

جلال الدین سیوطی ۳۹

جویریہؓ بنتِ حارث ۱۳۸

حسنؓ، سیّدنا ۱۲۳

حسینؓ، سیّدنا ۱۲۳، ۱۶۶

حفصہؓ، سیّدہ ۱۱۱، ۱۱۸، ۱۲۴

حکیم ابن حزام ۶۶، ۱۰۵

حلیس بن علقمہ ۱۴۴، ۱۴۵

حلیمہ سعدیہ ۱۳، ۲۲

حمزہؓ ۲۲، ۳۷، ۶۳، ۶۴، ۸۷، ۱۰۰، ۱۱۵، ۱۵۹

حیی ابن اخطب ۱۲۹، ۱۵۲

خالدؓ بن ولید ۵۸، ۱۳۲، ۱۴۲، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷

خبابؓ ۶۴

خدیجہؓ، سیّدہ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۶، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۳، ۸۱، ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۲۲

رقیہؓ، سیّدہ ۲۴، ۵۶، ۸۷، ۱۰۴، ۱۱۰

زہیر ابن ابی سلمٰی ۱۵

زیدؓ ابن حارث ۲۴، ۳۶، ۴۷، ۸۷، ۱۲۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۵۵، ۱۵۶

زید ابن عمرو ۳۰، ۳۱

زینبؓ بنتِ جحش ۳۷، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶

زینبؓ بنتِ خزیمہ ۱۱۸، ۱۲۲

زینبؓ، سیّدہ ۲۴، ۳۷، ۱۱۱، ۱۳۲، ۱۵۵

سعدؓ بن ابی وقاص ۵۰

سعدؓ بن عبادہ ۱۵۴

سعدؓ بن معاذ ۸۲، ۱۰۶، ۱۲۹، ۱۳۰

سعیدؓ ۶۴

سلام بن مشکن ۱۱۲

سلمان رشدی ۹

سلمان فارسیؓ ۱۲۸

سودہؓ، سیّدہ ۸۰، ۸۱، ۸۸، ۱۱۱، ۱۱۸

سہیل ابن عمرو ۵۸، ۸۰، ۸۱، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰

شیبہ بن ربیعہ ۵۸، ۷۰

صالح علیہ السلام ۳۸، ۶۰

صفوان بن اُمیہ ۱۴۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰

صفوانؓ بن معطل ۱۳۳، ۱۳۹

صفیہؓ، سیّدہ ۱۵۲

طلحہؓ ۷۰

عائشہ صدیقہؓ، سیّدہ ۸۰، ۸۱، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۴، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۶۳، ۱۶۴

عباسؓ ۲۳، ۳۷، ۸۶، ۱۰۵، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۴

عبداللہ ۲۲

Marfat.com

عبداللہ ابن ابی ۷۹، ۸۰، ۸۳، ۹۳، ۹۴، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۶۱، ۱۶۲

عبداللہ بن جحش ۳۷

عبداللہؓ، سیّدنا ۲۴

عبدالمطلب ۲۲، ۳۱، ۴۷

عبیداللہ بن جحش ۳۰، ۳۷، ۱۵۳

عبیدہؓ ابن الحارث ۱۰۰

عتبہ ابن ربیعہ ۵۸، ۷۰، ۷۱

عثمان غنیؓ ۵۶، ۸۷، ۹۰، ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۲۳، ۱۴۵، ۱۵۴، ۱۶۶

عداس ۷۱

عروہ ابن مسعود ۱۴۴، ۱۴۵

عکرمہ بن ابوجہل ۱۴۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰

علی المرتضیٰؓ ۲۴، ۳۶، ۴۶، ۴۷، ۸۸، ۱۱۱، ۱۲۳، ۱۴۸، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۷

عمر فاروقؓ ۵۸، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۸، ۸۷، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۹، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶

عمرو ابن العاص ۵۸، ۱۵۵

عیسیٰ علیہ السلام ۵، ۱۲، ۲۸، ۳۴، ۳۶، ۴۰، ۴۷، ۵۷، ۶۶، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷

فاختہ (ابوطالب کی بیٹی) ۲۳

فاطمہؓ سیّدہ ۲۴، ۶۹، ۱۱۱، ۱۲۳، ۱۵۸

فاطمہؓ بنتِ خطاب ۶۴

فرعون ۳۸، ۶۰

قاسمؓ، سیّدنا ۲۴

قصیٰ ابن کلاب ۱۸

گوتم بدھ ۵، ۱۶۶

لبید بن ربیعہ ۱۵

لوط علیہ السلام ۱۲

محمد ابن اسحٰق ۶، ۲۳، ۲۴، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۷، ۳۸، ۵۶، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۹، ۷۴، ۷۶، ۸۰، ۸۲، ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۲۲، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۳

محمد ابن سعد ۶، ۳۸، ۵۰، ۵۲، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۵۲

محمد ابن عمر الواقدی ۶، ۷۹، ۱۳۲، ۱۴۶، ۱۶۱

محمد البخاری ۱۱۲

مریم علیہ السلام ۱۵۸

مریمؓ (ماریہ قبطیہ) ۱۵۵

مطعم ۷۲، ۸۸

مصعبؓ ابن عمیر ۸۱، ۸۲، ۸۳

موسیٰ علیہ السلام ۱۲، ۳۳، ۳۶، ۵۷، ۶۰، ۶۶، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۱۵۲

Marfat.com

Izutsu 58,59,61,62,85

Johanne Slock 20

Josephus 29

Leila Ahmad 112,116,119,125, 136,137

M.J. Kister 114

Martin Lings 38,39,78,104,113, 114,120,121,123,124,127,132, 134,137,140,149,150,152,154,160

Maxime Rodinson 39

Michael Sells 41,42,43,75

Moshe Gil 94

Muhammad A. Bamyeh 21,50,82,87, 91,99,104,121,140,147,161

Nabia Abbott 112

Norman Stilman 130

Reza Aslan 55,66,78,79,87, 94,110,113,121,130

Rudolf otto 34

S.N Goitein 94

Salo Wiltmayer Baron 94

Tor Andrae 11,50,52,102,104, 134,140

W. Montgomery Watt 37,46,50,78, 85,86,94,100,102,104,110,113, 114,116,120,127,137,140,146

Wilfred Cantwell Smith 50,58,168

Yoga 42

❁ ❁❁.....❁

میمونہؓ بنتِ حارث ۱۵۴،۱۵۸،۱۶۳

نجاشی (شاہِ حبشہ) ۶۳،۱۵۳

نوح علیہ السلام ۱۲،۲۹،۶۰،۶۶

ورقہ بن نوفل ۳۰،۳۳

ہاجرہؓ ۲۹،۷۳،۱۶۲

ہارون علیہ السلام ۶۰،۷۳،۱۵۲

ہاشم ۲۲

ہدیل ۱۵۷

ہشام بن عمرو ۶۶

ہند ۱۱۵،۱۵۷،۱۵۹،۱۶۰

یحییٰ علیہ السلام ۷۳

یعقوب علیہ السلام ۷۶،۱۳۹

یوسف علیہ السلام ۶۶،۷۳،۱۴۰

یونس علیہ السلام ۶۶،۷۱

❁.....❁❁.....❁

Clinton 90

D.S, Margoliouth 94

David J. Helperin 94

F.E. Peters 27

Fatima Mernissi 90,107,112,117, 119,123,124,125,126,127,136, 137,147

Hanna Rehman 94

Ibn Al-Kalbi 28

Marfat.com

Muhammad: The Prophet for our Time

محمد ﷺ

پیغمبر عہد رواں

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

Marfat.com